

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

☆ دورِ حاضر میں خواتین کی ملازمت کا مسئلہ
سید جلال الدین عمری

☆ پلاسٹک سرجری - اسلام کا نقطۂ نظر
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

☆ عصر حاضر کے مسائل اور ان کا حل
پروفیسر عبدالرؤف ظفر

☆ کاروکاری کی رسم اور اسلامی تعلیمات
جناب ارشد منیر لغاری

☆ تاریخ ابن خلدون کے مترجم - حکیم احمد حسین عثمانی
ڈاکٹر محمد صہیب

☆ علم سیاست میں اسلامی علمی سرمایہ
مترجم: ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

☆ تعارف وتبصرہ

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی
نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل جون ۲۰۰۹ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

mrnadvi@yahoo.com

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Email: tahqeeqat_islami@yahoo.com, tahqeeqateislami@gmail.com

Website: www.tahqeeqi.com

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۲۸ شمارہ: ۲

ربیع الثانی ——— جمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ

اپریل ——— جون ۲۰۰۹ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپیے
سالانہ	۱۲۰ روپیے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپیے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

دورِ حاضر میں خواتین کی ملازمت کا مسئلہ — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

پلاسٹک سرجری - اسلام کا نقطۂ نظر — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۲۳

بحث ونظر

عصر حاضر کے مسائل اور ان کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں — پروفیسر عبدالرؤف ظفر — ۴۹

کاروکاری (قتلِ غیرت) کی رسم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں — جناب ارشد منیر لغاری — ۶۳

سیر وسوانح

تاریخ ابن خلدون کے مترجم ومحقق حکیم احمد حسین عثمانی — ڈاکٹر محمد صہیب — ۸۳

ترجمہ وتلخیص

علم سیاست میں اسلامی علمی سرمایہ — ڈاکٹر عثمان بن جمعۃ ضمیریۃ — ۱۰۱

مترجم: ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

تعارف وتبصرہ

کتاب المناقب — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۸

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۳۱) — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ محمد رضی الاسلام ندوی

ایم ڈی (کلیات وعلم الامراض) طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۲۔ پروفیسر عبدالرؤف ظفر

ڈائرکٹر سیرت چیر، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور (پاکستان)

۳۔ جناب ارشد منیر لغاری

لیکچرر زرعی کالج، ڈیرہ غازی خاں (پاکستان)

۴۔ ڈاکٹر محمد صہیب

۱۵۶-بی/۹-بی/۱، شمس نگر، کربلا باغ، الٰہ آباد

۵۔ ڈاکٹر عثمان بن جمعہ ضمیریہ

شارقہ یونی ورسٹی، متحدہ عرب امارات

۶۔ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

الہدی-۱۴۴-۱۴۵-سعید کالونی، بیرسیا روڈ، بھوپال

۷۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

دورِ حاضر میں خواتین کی ملازمت کا مسئلہ

——————سید جلال الدین عمری

اسلامک فقہ اکیڈمی کا اٹھارواں سمینار ۲۸ر فروری تا ۲ر مارچ ۲۰۰۹ء تمل ناڈو کے مشہور شہر مدورائی میں منعقد ہوا۔ اس کے موضوعات میں ایک موضوع موجودہ دور میں مسلم خواتین کی ملازمت سے متعلق تھا۔ اس مناسبت سے راقم نے ذیل کا مقالہ تحریر کیا۔ اس کے ضروری حصے سمینار میں پیش کیے اور بعض پہلوؤں کی زبانی وضاحت کی۔ یہی مقالہ نظر ثانی کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ سوالات فقہ اکیڈمی کے قائم کردہ ہیں۔ (جلال الدین)

خاندانی نظام میں عام طور پر مرد کی حیثیت سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے، بیوی بچوں اور بعض اوقات قریبی عزیزوں کی معاش اور دوسری ضروریات کا نظم کرتا ہے اور ان کی تعلیم وتربیت اور شادی بیاہ کے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ دوسری طرف عورت امور خانہ داری انجام دیتی ہے، جس میں گھر کے نظام کو ٹھیک رکھنا، بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش اور شوہر کے مال کی حفاظت جیسے امور شامل ہیں۔ خاندان کا یہی نظام عرب میں بھی رائج تھا۔ اس نظام میں بعض بڑی بے اعتدالیاں تھیں، ایک دوسرے کے حقوق متعین نہیں تھے، ذمہ داریاں واضح نہیں تھیں۔ بعض اوقات عدل وانصاف کے صریح تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے۔ عورت اپنی طبعی کم زوری کی وجہ سے سب کچھ برداشت کرتی تھی۔ اسلام نے خاندان کا نظام باقی رکھا، اسے مستحکم بنیادیں فراہم کیں، ظلم و ناانصافی سے پاک کیا، مرد اور عورت کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا، مرد کی مطلق بالا دستی ختم کی، عورت کی کمزوری کی رعایت کی اور اسے قانونی تحفظ فراہم کیا۔ خاندان کی بقا اور استحکام کے لیے اس نے مرد سے کہا کہ

وہ عورت کی معاش کا ذمہ دار ہے۔ یعنی از روئے قانون عورت کا یہ حق قرار دیا کہ مرد اس کا نان نفقہ برداشت کرے۔ اس انتظام کی بظاہر ایک حکمت یہ ہے کہ عورت گھر کے داخلی نظم کو چلانے کے لیے خود کو فارغ کر سکے۔

موجودہ دور میں جو سماجی تبدیلیاں آئی ہیں اور ضروریاتِ زندگی کا دائرہ جس طرح وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اس میں یہ ضروری سمجھا جانے لگا ہے کہ مرد کے ساتھ عورت بھی معاشی جدو جہد میں شریک ہو۔ آج کی عورت خود بھی معاشی طور پر خود کفیل ہونا چاہتی ہے اور خاوند یا کسی دوسرے فرد پر انحصار کرنا نہیں چاہتی۔ اسے اس کے مواقع بھی حاصل ہیں۔

آج بہت سی مسلمان خواتین، خصوصاً تعلیم یافتہ خواتین بھی اسی طرح سوچتی ہیں اور عملاً معیشت کے میدان میں حصہ لے رہی ہیں۔ ان کے سلسلے میں بعض جو سوالات ابھرتے ہیں، یہاں ان کا جواب دینے کی طالب علمانہ کوشش کی جارہی ہے۔

ا-سوال: شریعت اسلامی خواتین کے لیے کسبِ معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

جواب: اسلام نے عورت کو معاش کی فکر سے بڑی حد تک بے نیاز رکھا ہے۔ اس کے لیے وہ عام حالات میں مجبور نہیں ہے، لیکن اس کی معاشی جدو جہد کو ناپسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ رزق کو قرآن مجید میں اللہ کا فضل کہا گیا ہے اور اسے تلاش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ. (الجمعہ:۱۰)

جب نماز ختم ہوجائے تو (تمھیں اجازت ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

عورت کو بھی اللہ کا فضل تلاش کرنے کا حق ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے، عورت کو حاصل نہیں ہے۔ اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

عورت کو مختلف ذرائع سے مال حاصل ہوتا ہے، ان میں مہر اور میراث شامل ہے، جس کی مقدار بعض اوقات بڑی ہوسکتی ہے۔ تحفہ، عطیہ اور ہبہ کی شکل میں اس کے

پاس مال آ سکتا ہے، وہ چھوٹے بڑے وقف کی نگراں ہوسکتی ہے۔ازروئے شرع اسے اس کا حق ہے کہ اپنے سرمایہ کو ترقی دے اور اس کے اضافہ کے لیے کوشش کرے۔ وہ اپنی مرضی سے اس میں تصرف کا بھی حق رکھتی ہے۔علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، ابن المنذرؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کا مسلک ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

للمرأة الرشيدة التصرف في مالها كلها بالتبرّع و المعاوضة۔[1]

سمجھ دار عورت کے لیے اپنے پورے مال میں تصرف کا حق ہے۔اسے وہ نیک کاموں میں صرف کرسکتی ہے اور معاوضہ پر بھی لگا سکتی ہے۔

اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی کم سن لڑکی کا مال اس کے ولی کے پاس ہو تو جب وہ بالغ ہوجائے اور اسے سوجھ بوجھ حاصل ہوجائے تو اس کا مال اس کے حوالے کردیا جائے گا، چاہے اس کی شادی نہ ہوئی ہو۔یہی حضرت عطاء بن ابی رباح، امام ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، ابوثور اور ابن المنذر کا مسلک ہے۔[2]

۲-سوال: کیا شریعت نے خواتین پر بھی نان نفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے؟ (خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا)

جواب: شریعت نے عام حالات میں عورت پر معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔خود اس کا نفقہ پیدائش کے بعد سے بلوغ تک، بلکہ جب تک شادی نہ ہوجائے باپ کے ذمہ ہے۔شادی کے بعد شوہر پر اس کا نان نفقہ واجب ہے، لیکن بعض حالات میں کسی نہ کسی درجہ میں اس پر بھی معاشی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔اس کی بعض مثالیں ذیل میں دی جارہی ہیں:

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۶/۶۰۲، تحقیق الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی والدکتور عبدالفتاح محمد الحلو، ہجر القاہرۃ، ۱۹۹۲ء۔امام مالک کو اس سے اختلاف ہے۔ایک روایت امام محمد سے بھی اس کی تائید میں ہے کہ عورت اپنا مال شوہر کی اجازت کے بغیر ایک تہائی سے زیادہ صرف نہیں کرسکتی۔ابن قدامہ نے دلائل سے اس کی کم زوری واضح کی ہے۔ملاحظہ ہو: ص۶۰۲-۶۰۴

[2] ابن قدامہ، المغنی: ۶/۲۰۱-۲۰۲۔امام مالک اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ شادی سے پہلے اس کا مال اس کے حوالہ نہیں کیا جائے گا۔ابن قدامہ نے اس کا جواب دیا ہے اور اس کی کم زوری واضح کی ہے۔

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر بچوں کا باپ نہیں ہے تو ماں پر ان کا نان نفقہ واجب ہوگا۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

ان الام تجب نفقتها ويجب عليها ان تنفق على ولدها إذا لم يكن له اب وبهذا قال أبو حنيفة والشافعي۔[۱]

ماں کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اسی طرح ماں پر واجب ہے کہ وہ اپنی اولاد پر خرچ کرے اگر اس کا باپ نہ ہو۔ (امام احمد کے ساتھ) امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

فان اعسر الأب وجبت النفقة على الام، ولم ترجع بها عليه ان أيسر۔[۲]

اگر باپ تنگ دست ہو اور اولاد کا نفقہ نہ برداشت کر سکے تو ماں پر اس کا نفقہ واجب ہوجائے گا۔ یہ اس کی طرف سے قرض نہ ہوگا، اس لیے باپ بعد میں خوش حال یا صاحب حیثیت ہوجائے تو اس کا مطالبہ وہ اس سے نہ کر سکے گی۔

اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے:

ام معسرة وجدّة موسرة النفقة على الجدة۔[۳]

ماں تنگ دست اور دادی خوش حال ہے تو نفقہ دادی پر واجب ہوگا۔

بالغ اولاد جو اپنا خرچ نہیں اٹھا سکتی، اس کے متعلق فقہ حنفی کی معتبر کتاب قدوری میں کہا گیا ہے:

وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن على ابويه اثلاثاً، على الاب الثلثان وعلى الام الثلث۔[۴]

لڑکی جو بالغہ ہے اور لڑکا جو بلوغ کے بعد معذور اور اپاہج ہے اس کا نفقہ باپ اور ماں دونوں پر واجب ہوگا۔ باپ پر دو تہائی اور ماں پر ایک تہائی۔

---

[۱] ابن قدامہ، المغنی: ۱۱/۳۰۳۔ امام مالک کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک عصبات پر نفقہ واجب ہوتا ہے۔ ماں عصبہ نہیں ہے، اس لیے اس پر اولاد کا نفقہ واجب ہے نہ اولاد پر اس کا نان نفقہ لازم ہوتا ہے۔ حکی عن مالک انه لا نفقة عليها ولا لها لانها ليست عصبة لولدها۔ المغنی: ۱۱/۳۷۳

[۲] المغنی، ۱۱/۳۷۳

[۳] المغنی: ۱۱/۳۷۶

[۴] ہدایہ مع نصب الرایہ: ۳/ ۴۰۷۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۶ء

اسی طرح کہا گیا ہے کہ بھائی اگر تنگ دست ہے تو بہنوں پر ان کی میراث کے لحاظ سے نفقہ واجب ہے۔ (**ونفقة الأخ المعسر على الاخوات المتفرقات اخماساً على قدر الميراث**) وہ اس طرح کہ حقیقی بہن پر ۵/۳ اور اخیافی بہن اور علاتی بہن میں سے ہر ایک پر ۵/۱ ہوگا۔[۱]

اس وقت نفقات کے سلسلے میں فقہاء کی آراء اور ان کے دلائل زیر بحث نہیں ہیں۔[۲] یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ایسی صورتیں ہوسکتی ہیں جن میں اگر کہا جائے کہ عورت پر بھی از روئے شرع افرادِ خاندان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو جمہور فقہاء کی اسے تائید حاصل ہوگی۔

اس قانونی بحث سے قطع نظر افراد خاندان میں الفت ومحبت اور تعاون وہمدردی کے جو فطری جذبات پائے جاتے ہیں، ان کے کچھ اور تقاضے ہیں۔ اسلام ان جذبات کو ابھارتا اور تقویت پہنچاتا ہے۔ شوہر کا نفقہ بیوی پر کسی حال میں واجب نہیں ہے، لیکن خوش حال بیوی تنگ دست شوہر کی مدد کرسکے تو یہ اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہوگا۔ شریعت اسے بہت بڑے اجر وثواب کا عمل قرار دیتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، ان کی بیوی زینب ان پر اور اپنے یتیم بچوں پر (جو سابق شوہر سے تھے) خرچ کرتی تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا:

أيجزى عنّى ان انفق على زوجى وايتام فى حجرى.

کیا میرا اپنے شوہر پر اور اپنے ان یتیم بچوں پر جو میری حفاظت اور نگرانی میں ہیں، خرچ کرنا میری طرف سے کافی ہوجائے گا اور میں اپنے فرض سے سبک دوش ہوجاؤں گی۔

یہی سوال ایک اور خاتون کو درپیش تھا۔ آپ نے دونوں سے فرمایا:

---

[۱] ہدایہ مع فتح القدیر لابن الہمام: ۴/۳۸۱، دارالکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۵ء

[۲] اس سلسلے کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۲، جزء ۳، ص ۱۱۱-۱۱۳، دارالکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۸۸ء

لھما اجران: اجر القرابة واجر الصدقة۔[۱]

ہاں ان کے لیے دو اجر ہیں: ایک قرابت کا اجر اور ایک صدقہ کا اجر۔

حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ابوسلمہؓ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب ان کے بچوں پر اگر میں خرچ کروں تو کیا مجھے اس کا اجر ملے گا۔ میں انھیں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ بہرحال وہ میرے بچے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

نعم، لک اجر ما انفقت علیھم۔[۲]

ہاں تم ان پر جو کچھ خرچ کروگی اس کا تمھیں اجر ملے گا۔

بعض اوقات عورت پر افراد خاندان کی مدد کی اخلاقی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ یہ احادیث بتاتی ہیں کہ شوہر اور گھر کے دوسرے افراد ضرورت مند ہوں اور عورت ان کی ضرورت پوری کرے تو وہ دوسرے مداتِ خیر میں خرچ کرنے سے زیادہ اجر وثواب کی مستحق ہوگی۔ اس جذبہ سے اگر عورت اپنی مالی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوئی جائز تدبیر اختیار کرے تو اسے ناجائز نہیں، بلکہ جائز اور پسندیدہ ہی کہا جائے گا۔

۳- سوال: محض معیارِ زندگی کو بلند کرنے، یا وقت گزاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لیے معاشی جدوجہد کا کیا حکم ہے؟ جب کہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ اس میں تنگی ترشی سے کام چل سکتا ہے اور چلتا ہے؟

جواب: اسلام نے دنیا میں ملوث ہونے اور اپنی تمام توانائیوں کو اس میں لگانے سے منع کیا ہے اور قناعت کی تعلیم دی ہے، لیکن اگر کوئی شخص جائز اور حلال ذرائع سے مال حاصل کرتا اور آسائش و راحت کی زندگی گزارتا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ بشرطے کہ اس کی معاشی مصروفیات ایسی نہ ہوں کہ وہ خدا کو بھول جائے، اس کے بندوں کے حقوق کو فراموش کر بیٹھے اور دنیا پرستوں کی طرح غفلت کی زندگی گزارنے لگے۔ کاروبارِ دنیا اللہ کے نیک بندوں کو اس کی یاد سے، نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ وہ اللہ

---

[۱] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الزوج والایتام فی الحجر، مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین الخ۔

[۲] بخاری، کتاب النفقات، باب علی الوارث مثل ذلک

کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُونَ يَوْماً تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (النور:۳۷)

وہ لوگ کہ انھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غفلت میں نہیں ڈالتے۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں (خوف سے) الٹ جائیں گے۔

تجارت اور خرید وفروخت سے ضروریات زندگی بھی پوری ہوسکتی ہیں اور خوش حالی کا بھی امکان ہے۔ تجارت میں بالعموم یہ دونوں ہی باتیں پیش نظر ہوتی ہیں۔ مرد کی طرح عورت بھی اسلامی حدود میں عسرت کی جگہ راحت کی زندگی کے لیے تجارت یا کوئی جائز تدبیر اختیار کرے تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔ اس معاملہ میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

۴-سوال: خواتین کے لیے کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے میں کیا اس وقت بھی، جب کہ وہ اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں، اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا؟

جواب: عورت کے لیے اندرون خانہ اپنی معاشی مصروفیت کے لیے شوہر سے اجازت لینی ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے نان نفقہ کا از روئے شرع، مرد ذمہ دار ہے۔ وہ کسبِ معاش کے لیے مجبور نہیں ہے۔ عورت کا نان نفقہ مرد پر اس لیے بھی واجب ہے کہ وہ اس کا وقت لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عورت نان نفقہ کے عوض شوہر کے لیے اپنا وقت فارغ کرتی ہے۔ ہدایہ میں ہے:

النفقة جزاء الاحتباس، فكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه.

نفقہ عورت کو روکے رکھنے کا معاوضہ ہے۔ جو شخص دوسرے کے فائدے کے لیے محبوس ہے (اپنا وقت اسے دے رہا ہے) اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا۔

اس کی دلیل یہ دی گئی ہے:

اصله القاضی و العامل فی الصدقات[۱] اس کی اصل قاضی اور عامل صدقات ہے۔

قاضی اور عامل صدقات کے اوقات مسلمانوں کی فلاح کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں، اس لیے ان کا نفقہ بیت المال پر واجب ہوتا ہے۔ یہی معاملہ عورت کے نان نفقہ کا ہے۔ جب عورت کے اوقات شوہر کے لیے فارغ ہیں تو وہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسری مصروفیت نہیں اختیار کرسکتی۔

۵- سوال: اگر عورت کو کسب معاش کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو کیا اس کے لیے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے؟ گھر سے نکلنا مسافتِ سفر یا اس سے زیادہ کے لیے، یا اس سے کم کے لیے، دن کے وقت ہو یا رات کے وقت، ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، ان صورتوں میں حکم شرعی کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

جواب: عورت کے گھر کے اندر کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنے کے لیے جب شوہر کی اجازت ضروری ہے تو اس مقصد سے باہر نکلنے کے لیے بدرجۂ اولیٰ اجازت ضروری ہوگی۔ شوہر اسے اجازت دے بھی سکتا ہے اور منع بھی کرسکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

ولـلزوج منعها من الخروج الی ما لها منه بد. شوہر کو یہ حق ہے کہ عورت کو باہر نکلنے سے ان امور کے لیے بھی منع کردے جو اس کے لیے ضروری ہیں۔

مزید کہتے ہیں:

ولا یجوز لها الخروج الا باذنه[۲] عورت کے لیے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے۔

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شوہر کو قانونی طور پر اس کا حق ضرور ہے کہ بیوی کو اپنے والدین کی عیادت کے لیے جانے سے بھی منع کرے، لیکن یہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے منافی ہے۔ اس لیے اس کی اجازت اسے دینی چاہیے۔ اسی طرح وہ

---

۱ ہدایہ اولین، کتاب الطلاق، باب النفقہ، ص ۴۱۷، کتب خانہ رشیدیہ دہلی، ۱۳۵۰ھ

۲ ابن قدامہ، المغنی: ۱۰/۲۲۴

بیوی کو مسجد جانے سے روک سکتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ انھیں نہ روکا جائے۔[۱]

عورت کے سفر کے سلسلے میں حدیث میں صراحت ہے کہ بغیر محرم کے اس کا سفر کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ حکم کتنی مسافت کے لیے ہے اس سلسلے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا یحلّ لامرأة تومن باللہ والیوم الآخر، تسافر مسیرة یوم ولیلة الاّ مع ذی محرم علیھا[۲]

کسی عورت کے لیے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو جائز نہیں کہ کوئی ایسا سفر بغیر محرم کے کرے جس کی مسافت ایک دن اور رات کی ہو۔

اس روایت میں عورت کو (اگر محرم اس کے ساتھ نہ ہو تو) ایک دن کی مسافت والے سفر سے منع کیا گیا ہے۔ بعض دوسری روایات میں دو دن اور تین دن کی مسافت کا ذکر ہے۔ اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں مسافت کا ذکر ہی نہیں ہے۔

لا تسافر المرأة الا مع ذی محرم[۳] عورت سفر نہ کرے مگر محرم کے ساتھ۔

محدثین نے ان روایات میں یہ تطبیق دی ہے کہ اس اختلاف کا تعلق سوال کے اختلاف سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے عورت کے تین دن کے سفر کے متعلق، کسی نے دو دن اور کسی نے ایک دن کے سفر کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے ہر موقع پر یہ جواب دیا کہ اس کا بغیر محرم کے سفر کرنا منع ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں 'برید' کا لفظ آیا ہے، جو آدھے دن کے سفر کے لیے بولا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت بتاتی ہے کہ عورت کا بغیر محرم کے مطلق سفر صحیح نہیں ہے۔ اسی پر دوسری روایتوں کو محمول کرنا چاہیے۔[۴]

موجودہ دور میں سفر آسان ہوگیا ہے، فاصلے سمٹ گئے ہیں، آمد و رفت کے تیز رفتار ذرائع موجود ہیں، آدمی گھنٹوں میں ہزاروں میل کا سفر طے کرکے ایک ملک سے

---

۱ ابن قدامۃ، المغنی: ۲۲۴/۱۰
۲ مسلم، کتاب الحج، باب سفر المرأۃ مع محرم الی حج وغیرہ
۳ ان روایات کے لیے ملاحظہ ہو: مسلم، کتاب الحج، باب سفر المرأۃ مع محرم الی حج وغیرہ
۴ نووی، شرح مسلم، ج ۵، جزء ۹، ص ۸۷-۸۸، دارالکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۵ء

دوسرے ملک میں پہنچ جاتا ہے۔تمدنی حالات نے سفر کو ایک ضرورت بنادیا ہے اور چھوٹے بڑے سفر بہ کثرت ہونے لگے ہیں۔سفر میں اجنبی مرد اور عورت کے لیے خلوت کے امکانات اور مواقع ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے ،عورت کے ساتھ دست درازی بھی ہوسکتی ہے۔اس وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عورت کا تنہا سفر خطرات سے بالکل محفوظ ہے۔احتیاط کا تقاضا ہے کہ عورت کا سفر شوہر یا محرم کے ساتھ ہو۔اس پورے پس منظر میں اس مسئلہ پر مزید غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

جہاں تک اوقات ملازمت کا تعلق ہے آج کل ملازمت کبھی دن کی ہوتی ہے اور کبھی رات کی۔خطرات دونوں میں ہیں۔اس سلسلے میں کوئی اصول وضع نہیں کیا جاسکتا۔دین دار مرد اور عورت فائدے اور نقصان اور خطر اور عدم خطر کا خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں۔

عورت کی کفالت کی ذمہ داری اس کے ولی یا شوہر کی ہے۔اگر وہ اس ذمہ داری کے ادا کرنے سے معذور ہیں، یا عملاً ادا نہیں کررہے ہیں تو اس کے احکام دوسرے ہیں۔اس سے ان کا یہ حق ساقط نہیں ہوتا کہ ان کی اجازت ہی سے اسے گھر سے باہر نکلنا چاہیے۔

۶-سوال: خواتین کے لیے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود کیا ہیں؟

جواب: اس ذیل میں تین اہم اصول سامنے آتے ہیں:

۱-مرد ہو یا عورت وہ ایسی ملازمت نہیں اختیار کرسکتے جو شرعی نقطۂ نظر سے ناجائز ہو، جیسے بینک کی ملازمت، یا شراب اور جوئے کا کاروبار، یا اسی نوعیت کے دوسرے کام جن کی حرمت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

۲-عورت کو اس کے ولی یا شوہر کی اجازت حاصل ہو۔

۳-عورت اور مرد کا اختلاط نہ ہو۔

۷-سوال: ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے) جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں

مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارے کے ذمہ دار مرد ہوں، تو اس صورت میں پردے کے کیا احکام ہوں گے؟

اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لیے پردہ کی کیا حدود ہوں گی؟ اس سلسلے میں کیا سن رسیدہ خواتین اور جوان عورتوں کے درمیان فرق ہوگا؟

جواب: خواتین ایسے اداروں میں ملازمت کرسکتی ہیں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں، اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں۔ مرد ذمہ دار ہوں تو شرعی حدود کے اندر ان سے بات ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں دو امور غور طلب ہیں، ایک کا تعلق عورت کے حدودِ حجاب سے ہے، دوسرا مسئلہ ہے عورت کا کسی غیر محرم سے بات کرنا۔

جہاں تک عورت کے حجاب کا تعلق ہے۔ اس کا حجاب از روئے شرع پورے بدن کا ہے۔ وہ اپنے بدن کا کوئی حصہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں کھول سکتی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

المرأة عورة، فاذا خرجت استشرفها الشيطان۔[1]

عورت خود کو پوشیدہ رکھے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکنے لگتا ہے۔

مطلب یہ کہ عورت کو پردے میں ہونا چاہیے۔ جب وہ اس سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اپنی کارروائی شروع کردیتا ہے۔ اس میں خود عورت کے گم راہ ہونے یا کسی دوسرے کے گم راہ ہونے کا خطرہ ہے۔

فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ عورت کے چہرے اور ہاتھ کا بھی حجاب ہے یا وہ نامحرم کے سامنے انھیں کھول سکتی ہے؟۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے دونوں نقطۂ نظر بیان کیے ہیں او رثابت کیا ہے کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ بھی حدودِ حجاب میں شامل ہیں۔[2] (اس عاجز کی بھی یہی رائے ہے)

جب عورت کے پورے بدن کا حجاب ہے تو مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس

---

[1] ترمذی، کتاب الرضاع، باب: ۱۸

[2] ابن قدامۃ، المغنی، ۹/ ۴۹۸-۵۰۰

کے کسی حصۂ بدن کو بلا وجہ دیکھے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

نظر الرجل الی الاجنبیة من غیر سبب فانه محرم الی جمیعها[۱]	اجنبی عورت کے پورے ہی جسم کو بغیر کسی سبب کے دیکھنا مرد کے لیے حرام ہے۔

اس کے ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ وقت ضرورت اجنبی شخص کے سامنے کھول سکتی ہے اور وہ اسے دیکھ سکتا ہے۔

فقہ حنفی میں اس کے جواز کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

وینظر من الأجنبیة إلی وجهها وکفیها فقط للضّرورة[۲]	اجنبی عورت کے چہرے اور اس کی ہتھیلیوں کو آدمی صرف ضرورت کے تحت دیکھے گا۔

اس کے ساتھ تاتارخانیہ کے حوالے سے کہا گیا ہے:

النظر إلی وجه الأجنبیة الحرة لیس بحرام، ولکنه یکره لغیر حاجة[۳]	آزاد اجنبی عورت کے چہرے کو دیکھنا حرام تو نہیں ہے، لیکن بغیر کسی ضرورت کے دیکھنا مکروہ ہے۔

اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- کسی خاتون سے آدمی نکاح کرنا چاہے تو حدیث میں آتا ہے کہ ممکن ہو تو اسے دیکھ بھی لینا چاہیے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا خطب أحدکم المرأة فان استطاع أن ینظر إلی ما یدعوه إلی نکاحها فلیفعل[۴]	جب تم میں سے کوئی کسی عورت سے رشتہ کرے تو ہو سکے تو اسے وہ اس قدر دیکھ لے جو اسے اس سے نکاح پر آمادہ کرے۔

اس سے مراد، جیسا کہ فقہ حنفی میں کہا گیا ہے، چہرہ ہے۔[۵]

---

۱ ابن قدامۃ، المغنی، ۹/ ۴۹۸

۲ الدر المختار مع رد المحتار: ۹/ ۵۳۱، دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۴ء

۳ حوالہ سابق، ص ۵۳۲

۴ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی الرجل ینظر الی المرأة وہو یرید تزویجہا

۵ رد المحتار مع الدر المختار: ۹/ ۵۳۲

علماء کا اس کے جواز پر اتفاق ہے۔[۱]

۲- بعض اوقات عورت کو ہاتھ کلائیوں سے اوپر تک بھی کھولنے پڑتے ہیں۔ چناں چہ خادمائیں، جو اجرت پر روٹی اور کھانا پکاتی یا کپڑے دھوتی ہیں، ان کے ہاتھ عموماً کہنیوں تک کھلے رہتے ہیں، ان کا دیکھنا جائز نہیں ہے۔[۲]

۳- مرض عورت کے بدن کے کسی بھی حصہ میں ہو، طبیب اسے حسب ضرورت دیکھ سکتا ہے۔ اس میں ہاتھ اور چہرے کی قید نہیں ہے۔[۳]

۴- ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اگر کسی عورت سے کاروبار یا اجرت کا معاملہ ہو تو اس کے چہرے کو آدمی دیکھے گا، تاکہ اسے پہچان سکے اور نقصان ہو تو تاوان کا مطالبہ کر سکے۔ ایک روایت یہ ہے کہ امام احمدؒ نے اسے ناپسند کیا ہے، یا بڑی بوڑھی عورت سے متعلق قرار دیا ہے۔ لیکن ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق اس سے ہے کہ آدمی عورت کو بے ضرورت دیکھے:

فاما مع الحاجة وعدم الشهوة فلا بأس[۴]	لیکن جہاں ضرورت ہو اور شہوت نہ پائی جائے تو دیکھنے میں حرج نہیں ہے۔

۵- اسی طرح باندیوں کے احکامِ حجاب میں رعایت ہے۔ المغنی میں ہے:

الأمة يباح النظر منها إلى مايظهر غالباً[۵]	لونڈی کے جسم کا جو حصہ عموماً کھلا رہتا ہے اس کا دیکھنا جائز ہے۔

۶- غلام اپنی مالکہ کے چہرے اور ہاتھ کو بغیر شہوت کے دیکھ سکتا ہے، شہوت ہو تو دیکھنا جائز نہ ہوگا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک غلام کا حکم محرم کا ہے۔[۶]

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ عورت حسب ضرورت ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھ سکتی

---

[۱] ابن قدامہ، المغنی: ۹/۴۸۹
[۲] الدر المختار مع رد المحتار: ۹/۵۳۱
[۳] حوالہ سابق، ص ۵۳۳
[۴] المغنی، ۹/۴۹۸
[۵] حوالہ سابق
[۶] الدر المختار مع رد المحتار: ۹/۵۳۲

ہے اور مرد کے لیے اس کا دیکھنا جائز ہے، لیکن اس میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ اس سے شہوانی جذبات نہ مشتعل ہوں اور آدمی غلط روی نہ اختیار کرے۔

اب کسی نامحرم خاتون سے گفتگو کے مسئلہ کو لیجیے۔

فقہ حنفی کی رو سے عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے:

إن صوت المرأة عورة على الراجح[۱]	عورت کی آواز کا بھی راجح قول کے مطابق پردہ ہے۔

سلام کرنا سنت اور اس کا جواب دینا واجب ہے۔ اسی طرح چھینک کے بعد کوئی الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا سنت ہے۔ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے:

ولا يكلّم الأجنبية إلا عجوزاً عطست أو سلّمت فيشمتها لا يرد السلام عليها[۲]	اجنبی عورت سے آدمی بات نہیں کرے گا۔ ہاں اگر بوڑھی عورت چھینک کر الحمد للہ کہے تو یرحمک اللہ کہے گا، لیکن اس کے سلام کا زور سے جواب نہ دے گا۔

اس کے ساتھ ایک دوسری رائے بھی ملتی ہے، وہ یہ کہ:

يجوز الكلام المباح مع امرأة أجنبية.	اجنبی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جائز ہے جو مباح ہے۔

مزید کہا گیا ہے:

لا بأس بأن يتكلم مع النساء بما لا يحتاج اليه وليس هذا من الخوض فى ما لا يعنيه، انما ذلك فى كلام فيه اثم[۳]	اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی عورتوں کے ساتھ ایسی گفتگو کرے جس کی فی الواقع حاجت نہیں ہے۔ یہ لایعنی گفتگو میں نہیں آتا، لایعنی گفتگو وہ ہے جس سے گناہ لازم آئے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام اجنبی مرد اور عورت کے درمیان گفتگو پسند نہیں کرتا،

---

۱ الدر المختار مع رد المحتار: ۹/۵۳۱

۲ حوالہ سابق

۳ اس رائے کو نقل کرنے کے بعد ابن عابدین کہتے ہیں فالظاهر انه قول آخر او محمول على العجوز۔ رد المحتار: ۹/۵۳۰-۵۳۱

لیکن ساتھ ہی ضرورت کے وقت اس کی اجازت بھی موجود ہے۔ عورت احکام شریعت معلوم کرنے کے لیے مفتی یا عالم کے پاس جاسکتی ہے، قاضی کی عدالت میں حاضر ہوسکتی ہے اور شہادت دے سکتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے ازواج مطہرات کو جو ہدایت دی ہے وہ امت کی تمام خواتین کے لیے ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا. (الاحزاب:۳۲)	بات میں نزاکت اور نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ کوئی برا خیال کرنے لگے اور معروف بات کہو۔

اس آیت میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی اجنبی یا نامحرم سے گفتگو کرتے وقت عورت کو ایسا لوچ دار اور نزاکت بھرا انداز نہیں اختیار کرنا چاہیے جس سے کسی غلط کار اور بد باطن انسان کے دل میں کوئی برا خیال آنے لگے اور وہ اس سے کوئی غلط توقع قائم کر بیٹھے۔ دوسری بات یہ کہی گئی کہ بات چیت 'معروف' کی ہو، اس دائرے سے باہر نہ ہو 'معروف' میں گو وسعت ہے، لیکن اسے بہر حال 'منکر' کے حدود میں نہیں پہنچنا چاہیے۔

نامحرم عورت سے تنہائی میں ملاقات سے منع کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں شیطان کو در انداز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لا یخلون رجل بامرأة الاّ کان ثالثهما الشیطان[۱]	کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ ہرگز تنہائی نہ اختیار کرے، اس لیے کہ (اس صورت میں) شیطان ان دو کا تیسرا ہوتا ہے۔

جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو اس سے بھی خلوت میں ملاقات صحیح نہیں ہے۔[۲] اس لیے آفس ہو یا کوئی دوسری جگہ، نامحرم سے ملاقات یا گفتگو کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے فساد کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ البتہ مجلس یا مجمع میں نامحرم مردوں سے گفتگو یا اظہارِ خیال کی گنجائش ہے۔ فقہاء کے ہاں اجنبی عورت کے ساتھ محرم یا کوئی دوسرا قابل

---

[۱] ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی کراہیۃ الدخول علی المغیبات۔ مسند احمد، ۱/۱۸

[۲] ابن قدامہ، المغنی: ۹/۴۹۰

اعتماد مرد یا ثقہ عورت ہو تو اسے خلوت نہیں کہا جائے گا۔[۱] اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں نامحرم سے بات ہوسکتی ہے۔

جوان عورت اور سن رسیدہ عورت کے احکامِ حجاب میں قرآن نے فرق کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحاً فَلَیْسَ عَلَیْھِنَّ جُنَاحٌ أَن یَّضَعْنَ ثِیَابَھُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَۃٍ وَأَن یَسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّھُنَّ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ. (النور:۶۰)

اور بڑی بوڑھی عورتیں جن کے کسی نکاح کی توقع نہ ہو ان کو کوئی گناہ نہ ہوگا، اگر وہ اپنے (زائد) کپڑے اتار کر رکھ دیں، زینت کا اظہار نہ کریں۔ اگر وہ اس سے بچیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ سب باتیں سنتا اور جانتا ہے۔

درمختار میں ہے: ایسی بوڑھی عورت سے، جس سے نکاح کی خواہش نہیں کی جاتی، مصافحہ ہوسکتا ہے۔ کسی غیر اخلاقی حرکت کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے ہاتھ کو مس کیا جاسکتا ہے، اس کے ساتھ سفر ہوسکتا ہے۔[۲]

یہاں دو تین باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

۱- فقہاء کے ہاں نامحرم کے سامنے چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی گنجائش ضرور ملتی ہے، لیکن اس کا تعلق وقتی اور ہنگامی ضروریات سے ہے، اس لیے اسے قاعدۂ کلیہ بنانے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

۲- گنجائش سے حسب ضرورت ہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ جو شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے اسے دیکھ سکتا ہے، مصافحہ نہیں کرسکتا، اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ قضاء اور شہادت دینے کے لیے بھی قانونی ضرورت کے تحت اسے دیکھنے کی اجازت ہے، چھونے کی نہیں۔ اس لیے اصول یہ بیان ہوا ہے **الضرورات تتقدر بقدرھا**۔[۳]

---

۱ ردالمحتار مع الدرالمختار: ۹/۵۳۰

۲ الدرالمختار مع ردالمحتار: ۹/۵۲۹

۳ حوالہ سابق، ص ۵۳۳

۳- چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی جو صورتیں بیان ہوئی ہیں ان میں یہ شرط موجود ہے کہ جنسی جذبہ یا محرک نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس کا جواز ختم ہو جائے گا۔ غلام اپنی مالکہ کو بھی جنسی جذبہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مالکہ جوان ہو تو اسے دیکھنا نہیں چاہیے۔[۱]

باندی کے جسم کا جو حصہ بالعموم کھلا رہتا ہے اسے دیکھنے کا جواز ہے، لیکن باندی اگر خوب صورت ہے اور اسے دیکھنے سے جنسی جذبہ ابھر سکتا ہے تو اسے دیکھنا نہیں چاہیے۔[۲]

مطلقہ کے ساتھ کھانا کھانے کو امام احمد نے جائز نہیں قرار دیا ہے۔[۳]

اس پس منظر میں کسی خاتون کا سیلز گرل ہونا یا اسی نوع کا کوئی دوسرا کام کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں حدودِ حجاب کی پابندی ممکن نہیں ہے۔ اس میں نامحرم مردوں سے مسلسل ربط و تعلق اور ایک طرح کا اختلاط ہوتا ہے۔ کاروباری معاملات میں گاہک کو متاثر کرنے کے لیے گفتگو میں دل ربائی کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے جسے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بعض غور طلب پہلو

اس پورے مسئلہ پر موجودہ حالات کے پس منظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حدیث میں عورت کو شوہر کے گھر کی منتظمہ اور نگراں کہا گیا ہے۔

المرأة راعية على بيت بعلها و ولده وهي مسئوله عنهم[۴]

عورت شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

اس میں گھر کی دیکھ بھال، شوہر کے مال کی حفاظت، بچوں کی پرورش اور تربیت جیسے امور آتے ہیں۔ پہلے عورت اس کے لیے فارغ ہوتی تھی۔ بعض اوقات مرد کی معاش میں تعاون بھی کرتی تھی۔ لیکن اب حالات کافی بدل گئے ہیں۔

---

۱ الدر المختار مع رد المحتار، ص ۵۳۲
۲ حوالہ سابق
۳ ابن قدامہ، المغنی: ۹/ ۴۹۸-۴۹۹
۴ بخاری، کتاب العتق، باب کراہیۃ التطاول علی الرقیق، مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل

۱- امور خانہ داری، کھانے پینے کی تیاری، گھر کی صفائی اور بچوں کی پرورش میں پہلے عورت کا کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ غریب خاندان میں اس کا پورا وقت ہی لگ جاتا تھا، لیکن اب کم از کم شہری زندگی میں مشینی سہولتیں آ گئی ہیں جن کی وجہ سے ان کاموں میں اس کا بہت کم وقت صرف ہوتا ہے۔

۲- بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آیا، ملازم یا ملازمہ ہوتی ہے۔ تین چار سال کی عمر ہی سے وہ نرسری، اسکول اور پھر کالج چلے جاتے ہیں۔ بعض حالات میں اسکولی زندگی ہی سے ان کا قیام ہاسٹل میں ہوتا ہے۔

۳- زندگی گراں ہوگئی ہے، اخراجات بڑھ گئے ہیں، معیار زندگی بدل گیا ہے۔ اس وجہ سے مرد کی آمدنی بالعموم ناکافی ہوتی ہے۔ اس صورت میں ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ میاں بیوی صبر وشکر اور قناعت سے کام لیں اور شوہر کی آمدنی پر اکتفا کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جو عورت کوئی مناسب ذریعۂ معاش اختیار کر سکے وہ اختیار کرے اور بہتر زندگی گزارے۔

۴- بلاشبہ یہ مرد کا حق اور اختیار ہے کہ عورت کو کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنے کی اجازت دے یا نہ دے، لیکن ایک تعلیم یافتہ خاتون کو، جس کے پاس وقت بھی ہو اور جو اپنے اور خاندان کی فلاح کے لیے کچھ کر بھی سکتی ہو، اس سے منع کرنا ذہنی تناؤ اور کش مکش کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ پر قانونی نقطۂ نظر سے ہٹ کر خاندانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے۔[۱]

[۱] اس موضوع پر راقم نے اپنی کتاب 'اسلام کا عائلی نظام' مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی میں بھی بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو بحث 'دعوت اور معیشت'۔

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

تحقیق وتنقید

پلاسٹک سرجری - اسلام کا نقطۂ نظر

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اٹھارہویں سمینار (منعقدہ مدورائی، ۲۸/فروری تا ۲/ مارچ ۲۰۰۹ء) کا ایک موضوع پلاسٹک سرجری بھی تھا۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ذیل کا مقالہ اس کے لیے تحریر کیا تھا۔ اس طرح کے موضوعات میں اختلافِ رائے کی گنجائش رہتی ہے۔ جو حضرات علمی انداز میں اس کے کسی پہلو پر اظہار خیال فرمانا چاہیں وہ 'تحقیقاتِ اسلامی' کو اس کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ امید ہے 'تحقیقات اسلامی' کا حلقہ اس سے استفادہ کرے گا۔ (جلال الدین)

طب کی ایک شاخ، جس میں جسم انسانی کے کسی عضو کی ہیئت یا فعل کو درست کرنے کے لیے ایک خاص طرح کا آپریشن کیا جاتا ہے، پلاسٹک سرجری (Plastic Surgery) کہلاتی ہے۔ 'پلاسٹک' یونانی لفظ Plastikos سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو موڑنا، اسے نئی شکل دینا to mold, to shape (اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ سرجری کی اس قسم میں مخصوص کیمیاوی مادہ 'پلاسٹک' کا استعمال ہوتا ہے۔)

تاریخی پس منظر

انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ وہ صحت مند رہے، اسے کوئی بیماری لاحق نہ ہو، اس کے اعضائے بدن ٹھیک طریقے سے کام کرتے رہیں، ان کے افعال میں کوئی نقص وخلل واقع نہ ہو، ظاہری طور پر بھی ان میں کوئی عیب دکھائی نہ دے اور اس کی شخصیت پرکشش اور جاذب نظر معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی سبب سے اس کے کسی عضو میں

بدہیئتی پیدا ہوجائے تو وہ اس کے ازالے کی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ عضو اپنا مفوّضہ کام کرنا بند کردے یا اس میں کمی آجائے تو اسے درست کرنے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

دنیا کی تمام قوموں میں علاج معالجہ کی جن اولین تدابیر کا سراغ ملتا ہے ان میں اس پہلو کے بھی اشارے پائے جاتے ہیں۔ مورخین کے مطابق ہندوستان میں دو ہزار سال قبل مسیح اس عمل کا پتا چلتا ہے۔ مشہور ہندوستانی طبیب سشرت (Sushruta) نے (جس کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے) پلاسٹک سرجری کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم مصری طب میں بھی چہرے کے عمل جراحی سے متعلق بعض تفصیلات ملتی ہیں۔ اسی طرح پہلی صدی قبل مسیح میں رومی طب میں اس مخصوص عمل جراحی کی سادہ تکنیک کا سراغ ملتا ہے۔ یہ لوگ زخمی اور کٹے ہوئے کان کی اصلاح اور درستگی کا کام انجام دیتے تھے۔ اس طریقۂ علاج میں ہندوستانی اطباء کی مہارت سے دیگر ممالک میں بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ سشرت اور چرک (Charaka b.300BC) کی طبّی تصانیف کا عباسی عہد خلافت میں عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان سے عرب اطباء واقف ہوئے، پھر یہ ترجمے یورپ پہنچے تو ان سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اٹلی میں Branca Family of Sicily (15th century) اور Gaspare TagliaCozzi (Bologna) سشرت کی تکنیک سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کچھ برطانوی طبیبوں نے ہندوستان کا سفر کیا، تاکہ ناک کی پلاسٹک سرجری کا مشاہدہ کریں، جو یہاں مقامی طریقوں سے انجام دی جاتی تھی۔ اس کی رپورٹیں Gentleman's Magazine میں شائع ہوئیں۔ اسی طرح پلاسٹک سرجری کے مقامی طریقوں کا مطالعہ کرنے کے لیے Joseph Constantine Carpue(1764-1846) نے ہندوستان میں بیس سال گزارے۔ چوں کہ عمل جراحی میں بہت زیادہ خطرات تھے، خاص طور سے اس صورت میں جب معاملہ سر اور چہرے کا ہو، اس لیے ناگزیر حالت ہی میں اس کو انجام دیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں پلاسٹک سرجری کو کچھ زیادہ رواج ملا اور اس میدان میں نئی نئی تکنیکیں ایجاد ہوئیں اور نئے نئے تجربات کیے گئے۔ اس کا اندازہ درج ذیل تجربات

سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے جنھیں اس میدان کے اہم سنگ ہائے میل کہنا بے جا نہ ہوگا۔

۱۸۱۵ء میں Joseph Carpue نے ایک برطانوی فوجی آفیسر کی پلاسٹک سرجری کی جو mercury treatment کے سمّی اثرات کے نتیجے میں اپنی ناک گنوا بیٹھا تھا۔

۱۸۱۸ء میں جرمن سرجن Carl Ferdinand Von Graefe (1787-1840) نے اپنی کتاب Rhinoplastic شائع کی۔اس میں اس نے اطالوی طریقۂ جراحی میں تبدیلی کرتے ہوئے Original Delayed Pedicle Flap کے بجائے بازو کی کھال لگانے (Free Skin graft) کا طریقہ ایجاد کیا۔

۱۸۲۷ء میں امریکن سرجن Dr. John Peter Mattauer(1787-1875) نے اپنے ہی تیار کردہ آلات سے تالو میں شگاف (Cleft Palate) کا پہلا آپریشن کیا۔

۱۸۴۵ء میں Johann Friedrich Dieffenbach(1792-1847) نے ناک کی پلاسٹک سرجری پر ایک مبسوط تحریر لکھی جس کا عنوان Operatiue Chirurgie تھا۔اس میں اس نے اصلاح شدہ ناک کے جمالیاتی مظہر کو بہتر بنانے کے لیے دوبارہ آپریشن کا تصور پیش کیا۔

۱۸۸۹ء میں امریکن سرجن George Monks(1853-1933) نے درمیان میں پچکی ہوئی ناک (Saddle nose) کے نقص کو دور کرنے کے لیے دوسرے مقام کی ہڈی استعمال کرنے (Heterogeneous free bone grafting) کا کامیاب تجربہ کیا۔

۱۸۹۱ء میں کان، ناک اور حلق کے امراض کے امریکی ماہر John Orlando Roe (1848-1915) نے ایک نوجوان خاتون کی ناک کے پچھلے ابھار کو کم کرنے کے لیے آپریشن کیا۔

۱۸۹۲ء میں Robert weir نے پچکی ہوئی ناک (Sunken nose) درست کرنے

کے لیے بطخ کے سینے کی ہڈی (Duck sternum) استعمال کرنے کا تجربہ (Xenograft) کیا، لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ملی۔

۱۸۹۶ء میں جرمن سرجن (1848-1926) Jemes Adolf Israel نے امریکن سرجن George Monks کے مثل ناک کے نقص کو دور کرنے کے لیے دوسرے مقام کی ہڈی استعمال کی۔

۱۸۹۸ء میں جرمن آرتھو پیڈک سرجن (1843-1907)Jacques Joseph نے ناک کے ابھار کو کم کرنے (Reduction Rhinoplasty) کا اپنا پہلا تجربہ شائع کیا۔

نیا زمانہ، نئے مسائل

پلاسٹک سرجری کے میدان میں بیسویں صدی میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی فوجی Walter Yeo غالباً پہلا شخص ہے جس کے چہرے کی ۱۹۱۷ء میں Skin graft کے ذریعہ کامیاب سرجری کی گئی۔

جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴ء) اپنے ساتھ بھیانک تباہی لائی۔ بہت سے لوگ اس میں ہلاک ہوئے اور ان سے کہیں زیادہ تعداد میں زخمی ہوئے۔ بہت سے فوجی ہاتھ پیر سے معذور ہو گئے۔ ان کے بدن اور چہرے جھلس گئے۔ اس موقع پر بہت سے ممالک میں پلاسٹک سرجری کے کامیاب تجربے ہوئے۔ یہی صورت حال جنگ عظیم دوم (۴۵-۱۹۳۹ء) کے بعد بھی پیش آئی۔

نیوزی لینڈ کے سرجن ماہر امراض کان وحلق Sir Harold Delf Gillies (1882-1960) نے ان لوگوں کے لیے، جن کے چہروں پر جنگ عظیم اول کے درمیان گہرے زخم آئے تھے اور وہ مسخ ہو گئے تھے، جدید پلاسٹک سرجری کے بہت سے طریقوں کو ترقی دی۔

امریکہ میں Dr.Vilray Papin Blair(1871-1955) نے جنگ عظیم اول کے فوجیوں کے جبڑوں اور چہروں کو لاحق ہونے والے پیچیدہ زخموں Complex

Maxillofacial injuries کے کامیاب آپریشن کیے۔اس کی کوششوں سے امریکی ملٹری ہاسپٹل میں پلاسٹک سرجری کا مستقل شعبہ قائم ہوا، جس کے بعد برطانیہ، فرانس، کناڈا اور دیگر ممالک میں بھی اس طرح کے شعبے قائم ہوئے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد نیوزی لینڈ کے سرجن Sir Archibald McIndoe (1900-1960) نے جو Sir Harold کا شاگرد تھا، Royal Air Force کے فوجیوں کا ابتدائی علاج کیا، جن کے بدن جھلس گئے تھے۔

امریکہ میں چہرے کی سرجری اور پلاسٹک سرجری سے متعلق ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام تھا: American Association of Oral and Plastic Surgery۔ بعد میں یہ انجمن دو ذیلی انجمنوں میں تقسیم ہوگئی:

(1) American Association of Plastic Surgeons

(2)American Assocation of oral and

Maxillofacial Surgeons

ان تمام کوششوں اور خدمات کے باوجود پلاسٹک سرجری طب کا ایک مخصوص اور محدود شعبہ تھا، جس کے تحت جسمانی عیوب و نقائص کی اصلاح کی جاتی تھی۔ جنگوں اور حادثات و آفات کے مواقع پر تو پلاسٹک سرجری کے ضرورت مند متاثرین کی تعداد بڑھ جاتی تھی، لیکن عام حالات میں ایسے مریضوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی، لیکن جب سے اس میں ایک نئے ذیلی شعبے کو متعارف کرایا گیا، جس کا مقصد انسان کے ظاہری حسن و جمال میں اضافہ تھا، اس وقت سے یہ شعبہ کافی مقبول ہوگیا۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دیکھنے میں اچھا لگے، اس کا چہرہ خوب صورت معلوم ہو، اس کے اعضاء چست دکھائی دیں اور ان پر درازئ عمر کے اثرات عیاں نہ ہوں۔ اس نئے شعبے سے ان کی یہ خواہشات پوری ہوتی نظر آئیں۔ مختلف ممالک میں مختلف سطحوں پر منعقد ہونے والے حسن کے مقابلوں، فلمی دنیا کی چمک دمک، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دل فریب (Glamorous) زندگی اور دیگر عوامل و محرکات نے پلاسٹک سرجری سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں سیکڑوں گنا اضافہ کردیا اور اس فن نے بہت زیادہ منافع بخش کاروبار کی

شکل اختیار کر لی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جس کے مطابق ۲۰۰۶ء میں صرف امریکہ میں پلاسٹک سرجری کے تقریباً گیارہ ملین آپریشن کیے گئے۔ پھر جب پلاسٹک سرجری کاروبار بن گئی تو اس کی خواہش رکھنے والے یہ تلاش کرنے لگے کہ کہاں کم سے کم خرچ پر یہ آپریشن کرائے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے کیوبا، تھائی لینڈ، ارجنٹائنا، ہندوستان اور مشرقی یورپ کے بعض ممالک کی نشان دہی کی گئی۔ آپریشن، آپریشن ہے۔ اس میں بہت سے خطرات پائے جاتے ہیں اور بہت سی پیچیدگیوں کا اندیشہ رہتا ہے۔ لیکن ان سے بے پروا ہوکر ایک دوڑ لگی ہوئی ہے اور اس فن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔

مقاصد اور میدانِ عمل

مقاصد کے اعتبار سے پلاسٹک سرجری کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف۔ اصلاحی عمل جراحی (Reconstructive Surgery)

پلاسٹک سرجری کا مقصد بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ جسم میں پائے جانے والے کسی ایسے عیب یا نقص کو دور کیا جائے جس سے انسان دیکھنے میں بدہیئت نظر آرہا ہو، یا کسی ایسے عضو کی کارکردگی کو بحال کیا جائے یا بہتر بنایا جائے جس کی منفعت ختم یا کم ہوگئی ہو۔ یہ عیب یا نقص خِلقی (Congenital) بھی ہوسکتا ہے اور حادثاتی (Accidental) بھی۔

جن صورتوں میں اس قسم کی سرجری کی ضرورت پڑتی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

- پیدائشی نقائص (Congenital abnormalities) جیسے ہونٹ کا کٹا ہونا (Cleft lip) تالو کا کٹا ہونا (Cleft Palate)، کان کا بیرونی حصہ نہ ہونا۔ سر کی ہڈیوں کا باہم ملا ہونا (Craniosynostosis) ہاتھ کے پیدائشی نقائص (Congenital hand deformities)
- بچوں کی نشوونما کے نقائص (Developmental Abnormalities)
- چوٹ لگنے کی وجہ سے پہنچنے والے زخم جیسے سر اور چہرے کی ہڈیوں کا ٹوٹ جانا (Craniofacial Skeleton Fracture)

- جسم کا جھلس جانا (Burns)
- ٹیومر یا کینسر، جیسے پستان کا کینسر (Breast Cancer) سر یا گردن کے کینسر (Craniocervical Cancer) جلد کا کینسر (Skin Cancer)
- گنجا پن (Baldness)

ب۔ تجمیلی عمل جراحی (Cosmetic or Aesthetic Surgery)

بسا اوقات پلاسٹک سرجری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اعضاء کی ساخت میں مناسب تبدیلی کر کے انسان کی ظاہری ہیئت کو خوب صورت اور پرکشش بنایا جائے۔ اسی طرح عمر ڈھلنے کے ساتھ انسان کے اعضاء میں ڈھیلا پن اور کچھ بدہیئتی آ جاتی ہے۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سرجری کی اس قسم کے ذریعے جو افعال انجام دیے جاتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

- پیٹ کا ڈھیلا پن دور کرنا (Abdominoplasty)
- ڈھلک جانے والے پلکوں کو نئی شکل دینا (Blepharoplasty)
- چھوٹے پستان کو بڑا کرنا (Breast Augmentation)
- بڑے پستان کو چھوٹا کرنا (Breast Reduction)
- پستانوں کا ڈھیلا پن کم کر کے انھیں اوپر اٹھانا یا نئی شکل دینا (Mastopexy)
- کولہوں کو اوپر اٹھانا (Buttock Augmentation)
- ناک کو نئی شکل دینا (Rhinoplasty)
- کان کو نئی شکل دینا (Otoplasty)
- چہرے سے جھرّیاں اور بڑھاپے کی علامات دور کرنا (Rhytidectomy)
- ٹھڈّی کو اوپر اٹھانا (Chin Augmentation)
- رخسار کو اوپر اٹھانا (Cheek Augmentation)
- جلد کو خوب صورت بنانا (Laser skin resurfing)

- مَردوں کا سینہ کشادہ کرنا (Male Pectoral Implant)
- چہرے سے مہاسے، چیچک کے داغ اور دیگر نشانات ختم کرنا (Chemical Peel)
- ہونٹ کو نئی شکل دینا (Labia Plasty)
- جسم سے چربی کم کرنا (Suction-Assisted Lipectomy)

سرجری کا طریقۂ کار

پلاسٹک سرجری کے لیے عموماً درج ذیل طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے:

- اعضاء کے عیب یا نقص کو دور کرنے کے لیے آپریشن کیے جاتے ہیں۔
- موٹے لوگوں میں بدن سے زائد چربی کو زائل کر کے اسے دبلا اور چھریرا بنایا جاتا ہے۔
- بدن کے دوسرے حصوں سے چربی کو منتقل کر کے کولہے ابھارے جاتے ہیں۔
- جسم جھلس جانے کی صورت میں لیفی انسجہ (Fibrous tissues) جن میں بہت زیادہ کھنچاؤ ہوتا ہے، انھیں آپریشن کر کے نکال دیا جاتا ہے اور صحیح جلد کو ملا کر جوڑ دیا جاتا ہے۔
- جلد کو خوب صورت بنانے کے لیے Laser Technique سے مدد لی جاتی ہے۔
- ایک عام اور اہم طریقہ Microsurgery کہلاتا ہے۔ اس میں کسی عضو کے نقص کو چھپانے کے لیے جلد، عضلہ، ہڈی یا چربی کے نسیج (Tissue) کو دوسری جگہ سے متاثرہ جگہ تک منتقل کیا جاتا ہے اور وہاں کی عروق دمویہ کو جوڑ کر خون کی سپلائی جاری کر دی جاتی ہے۔ یہ تکنیک جلد کی منتقلی کے سلسلے میں کثرت سے مستعمل ہے۔ اسے Skin grafting کہتے ہیں۔[۱]

حل طلب مسائل

پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں درج بالا تفصیلات کی روشنی میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں جنھیں شریعت اسلامی کی روشنی میں حل کیا جانا موجودہ دور کا اہم تقاضا ہے۔ وہ

سوالات درج ذیل ہیں:

۱۔ کوئی ایسا عیب جو انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہو اور اس کی وجہ سے وہ بدہیئت نظر آ رہا ہو اور وہ عیب عام قانون فطرت کے خلاف ہو، کیا اس کو دور کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا جائز ہوگا؟

۲۔ کوئی ایسا عیب جو پیدائشی طور پر نہ ہو، بلکہ کسی حادثہ کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو اور اس کی وجہ سے انسان بدہیئت معلوم ہو رہا ہو، کیا اس کے علاج کیلئے پلاسٹک سرجری کرانا درست ہوگا؟

۳۔ جسم انسانی کی بعض ہیئتیں عام قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہوتیں اور ان کا شمار عیب میں نہیں کیا جاتا، لیکن بعض افراد کو وہ پسند نہیں ہوتیں۔ اسی طرح بعض ہیئتیں بعض افراد کو پسند ہوتی ہیں، لیکن وہ ان کے بدن میں نہیں پائی جاتیں۔ کیا ناپسندیدہ ہیئتوں کو زائل کرنے اور پسندیدہ ہیئتوں کو حاصل کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا جائز ہے؟

۴۔ بعض عیوب یا ناپسندیدہ ہیئتیں عمر زیادہ ہونے کے ساتھ فطری طور پر ہر شخص کے بدن میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کیا ان عیوب یا ہیئتوں کے ازالہ کے لیے آپریشن کرانا جائز ہے؟

۵۔ کیا کم عمر اور خوب صورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرائی جا سکتی ہے؟

۶۔ شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانے کا کیا حکم ہے؟

اسلام کی اصولی تعلیمات

مذکورہ مسائل کا تجزیہ کرنے اور شریعت اسلامی میں ان کا حکم دریافت کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی بعض اصولی تعلیمات پیش نظر رکھی جائیں، کیوں کہ ان کی روشنی میں ان مسائل کا حل دریافت کرنا اور ان کا حکم مستنبط کرنا آسان ہوگا۔

۱۔ اللہ تعالی نے انسانوں کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے (لَقَدْ خَلَقْنَا

الاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْم۔التین:۴) اس نے انھیں ہاتھ، پیر، دل، دماغ، زبان، ہونٹ، آنکھ، کان، ناک اور دیگر اعضائے بدن سے نوازا ہے، تاکہ وہ انھیں کام میں لائیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ اعضائے بدن اللہ تعالی کی امانت ہیں اور اس امانت کی حفاظت کرنا ان پر فرض ہے۔ ان اعضائے بدن کے جو مفوّضہ کام ہیں اگر ان میں کوئی خلل کسی خِلقی بیماری کی وجہ سے یا حادثاتی طور پر واقع ہو تو اسے دور کرنا شریعت میں مطلوب ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کچھ بدّو وخدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج معالجہ کر سکتے ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا:

نعم ،یاعباداللہ تداووا فان اللہ لم یضع داءً االّاوضع لہ شفاءً ا (اوقال دواءً) [۲]	ہاں، اے اللہ کے بندو، علاج کراؤ، اس لیے کہ اللہ نے جو بیماری بھی پیدا کی ہے اس کے لیے شفا (یا فرمایا: دوا) بھی رکھی ہے۔

۲۔ جس طرح بیماری یہ ہے کہ جسم انسانی کا کوئی عضو کلّی یا جزئی طور پر اپنا مفوّضہ کام کرنا بند کر دے، اسی طرح بیماری یہ بھی ہے کہ انسان دیکھنے میں کسی خاص وجہ سے بدہیئت نظر آئے۔ بدہیئتی سے اگرچہ انسان کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوتی، لیکن اس سے جو ذہنی اور نفسیاتی تکلیف پہنچتی ہے، وہ جسمانی تکلیف سے کسی طرح کم نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات اس کی اذیّت جسمانی اذیّت سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ دونوں طرح کی بیماریاں پیدائشی بھی ہوسکتی ہیں اور کسی حادثہ کے نتیجے میں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ شریعت نے علاج معالجہ کے سلسلے میں بیماریوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے، بلکہ ہر طرح کی بیماری کا مداوا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ کائنات کے دیگر مظاہر کی طرح انسانوں کی تخلیق میں بھی اللہ تعالی کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ (الجاثیہ:۴) ان نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو ایک ہیئت پر نہیں پیدا کیا ہے۔ ان کی تخلیق میں پائے جانے والے فرق اس کی خلّاقی پر دلالت کرتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں تشبّہ سے منع کیا گیا ہے۔ تشبّہ کا مطلب ہے دوسرے جیسا بننے کی کوشش کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

لعن رسول الله ﷺ المتشبهين من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال [۳]

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں تشبّہ کی صرف ایک صورت کا تذکرہ ہے۔اس طرح کی دیگر اور بھی جو مشابہتیں ہوسکتی ہیں، وہ شریعت میں مذموم اور ناپسندیدہ ہیں۔

۴۔ اللہ تعالی کی تخلیق میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کرنے کو اسلامی شریعت میں سخت ناپسندیدہ اور شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔سورۂ نساء میں ہے کہ شیطان نے بارگاہ الٰہی میں لعنتی قرار پانے کے بعد اللہ کے بندوں کو جن طریقوں سے گم راہ کرنے کے منصوبے کا انکشاف کیا تھا ان میں سے یہ بھی تھا: وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (النساء:۱۱۹) (اور میں انھیں حکم دوں گا تو وہ (میرے حکم سے) خدائی ساخت میں ردّ و بدل کریں گے)۔ یہ ایک بہت وسیع تعبیر ہے، جس میں انسانی بناوٹ میں تبدیلی لانا بھی شامل ہے۔[۴]

۵۔ انسان اپنی زندگی میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔بچپن، جوانی اور بڑھاپا اس کے سفر زندگی کے اہم مرحلے ہیں۔ یہ مراحل اس فطرت کے عین مطابق ہیں جس پر اللہ تعالی نے اسے پیدا کیا ہے۔قرآن میں اس مظہر کو اللہ کی نشانی کے طور سے پیش کیا گیا ہے۔(الروم:۵۴) ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلے میں منتقلی کے ساتھ انسان کے بدن میں کچھ تغیّرات واقع ہوتے ہیں۔یہ تغیرات اللہ تعالی کے طے کردہ قوانین فطرت کا حصہ ہیں۔انھیں روکنے یا ان میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنا بھی 'تغییر خلق اللہ' کے مثل ہے۔

۶۔ اسلامی شریعت نے انسانوں کے باہمی معاملات میں سچائی اور اظہار حقیقت کو پسندیدہ رویّہ قرار دیا ہے اور جھوٹ، مکر و فریب، دھوکہ دہی اور غلط بیانی سے روکا ہے۔

پلاسٹک سرجری کی مختلف صورتوں کے بارے میں شرعی حکم

پلاسٹک سرجری سے متعلق مسائل کا تعلق موجودہ دور کے نئے مسائل سے ہے۔

اس لیے قدیم فقہاء کی تحریروں میں ان سے متعلق احکام صراحت سے نہیں مل سکتے۔ اسلام کی مذکورہ بالا اصولی تعلیمات اور قرآن وحدیث اور قدیم فقہاء کی تحریروں کے اشارات سے ان کے احکام معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض صورتوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱۔ خِلقی بدہیئتی جو عام قانون فطرت کے خلاف ہو۔

بسا اوقات انسان میں پیدائشی طور پر کوئی ایسا عیب پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی بدہیئتی نمایاں ہوتی ہے اور وہ عیب عام قانون فطرت کے خلاف ہوتا ہے، مثلاً ہونٹ یا تالو کٹا ہوا ہو، ہاتھ یا پیر میں زائد انگلی ہو، منہ میں زائد دانت ہو، یا کوئی دانت زیادہ لمبا ہو، یا اس طرح کا اور کوئی عیب۔ کیا ایسی بدہیئتی کی اصلاح کی جاسکتی ہے؟

قاضی عیاضؒ (م ۵۴۴ھ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے کسی انسان کو جس طرح بھی پیدا کیا ہو اس کے لیے اپنے اعضاء میں کوئی کمی یا تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے:

''جس شخص کے بدن میں کوئی انگلی یا کوئی دوسرا عضو زائد ہو، اس کے لیے اسے کاٹنا یا علیٰحدہ کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالی کی تخلیق میں تبدیلی ہے''۵

یہی بات ابوجعفر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) نے زائد یا لمبے دانت کے سلسلے میں کہی ہے۔۶

یہ حضرات ان کاموں کو اس صورت میں ناجائز کہتے ہیں جب انھیں محض بدہیئتی کو دور کرنے کے لیے انجام دیا جائے۔ البتہ اگر ان کی وجہ سے معمول کے کاموں میں رکاوٹ آرہی ہو، مثلاً زائد یا لمبے دانت کی وجہ سے کھانے میں دشواری ہوتی ہو، یا زائد انگلی سے کوئی جسمانی اذیت لاحق ہوتی ہو تو ان کے نزدیک انگلی کو کٹوایا اور دانت کو نکلوایا جاسکتا ہے۔ طبری فرماتے ہیں:

''اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جس سے ضرر اور تکلیف لاحق ہوتی ہو، مثلاً کسی عورت کے منہ میں زائد یا لمبا دانت ہو جس سے وہ صحیح طریقے سے کھانا نہ کھا پاتی ہو، یا زائد انگلی جس سے اسے اذیت یا تکلیف ہوتی ہو

تو اس کے لیے انگلی کٹوانا اور دانت اکھڑوانا ہے جائز ہے ۔اس آخری معاملے میں مرد عورت کے مثل ہے''۷

فقہ حنفی میں یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے، البتہ کہا گیا ہے کہ یہ کام اسی وقت کروایا جائے جب اس کی وجہ سے جان کا خطرہ نہ ہو:

''اگر کوئی شخص اپنی زائد انگلی یا کوئی دوسرا عضو کٹوانا چاہے تو نصیرؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو تو نہ کرے اور اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس سے ہلاک نہیں ہوگا تو اسے کٹوا سکتا ہے۔''۸

ہمارے خیال میں کسی بدہیئتی کے ازالہ کے لیے محض جسمانی اذیت اور دشواری ہی کی شرط نہ ہو، بلکہ ذہنی اور نفسیاتی اذیّت کو بھی اسی درجے میں رکھا جانا چاہیے۔ چوں کہ بدہیئتی عام قانونِ فطرت کے خلاف ہوتی ہے، اس لیے انسان دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خفّت اور سبکی محسوس کرتا ہے ۔اس سے اسے جو ذہنی اور نفسیاتی اذیت محسوس ہوتی ہے وہ جسمانی اذیت سے کم نہیں ہوتی ۔اس لیے اسے اس کے ازالے اور اصلاح کی اجازت دی جانی چاہیے۔

عام قانونِ فطرت کے خلاف پائی جانے والی بدہیئتی ایک بیماری ہے اور شریعت نے بیماری کا علاج معالجہ کرنے کی نہ صرف اجازت، بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔

۲۔ کسی حادثہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدہیئتی

یہ بھی ممکن ہے کہ بدہیئتی پیدائشی نہ ہو، بلکہ کسی حادثہ کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہو۔ مثلاً کسی ایکسیڈنٹ میں آدمی کی ناک ٹوٹ گئی، یا کان کٹ گیا، یا گھر میں آگ لگ گئی جس سے اس کی جلد جھلس گئی، یا کسی نے گولی ماردی جس سے بدن کے کسی حصے کا گوشت اڑ گیا، یا اس طرح کی کوئی دوسری صورت ہو۔اس میں آدمی کے بدن میں عیب پہلے نہیں ہوتا، بلکہ حادثاتی طور پر بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔اس طرح کے کسی عیب کے 'بیماری' میں شمار کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس لیے اس کے علاج کی اجازت ہوگی۔

غزوۂ خندق کے موقع پر دشمنوں کی جانب سے حضرت سعد بن معاذؓ کو ایک تیر

آ کر لگا، جس سے ان کے بازو کی ایک رگ زخمی ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے مسجدِ نبوی میں خیمہ لگوایا اور ان کے علاج معالجہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔[۹]

صحابیِ رسول حضرت عرفجہ بن اسعدؓ کی ناک عہد جاہلیت میں ہونے والی جنگِ کلاب میں کٹ گئی تھی۔ انھوں نے اس کی جگہ چاندی کی ناک لگوالی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اس میں بدبو پیدا ہوگئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں سونے کی ناک بنوانے کا مشورہ دیا تھا۔[۱۰]

غزوۂ بدر میں حضرت رافع بن مالکؓ کو ایک تیر آ کر لگا جس سے ان کی آنکھ زخمی ہوگئی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اس میں اپنا لعابِ دہن لگا دیا اور میرے لیے دعا کی، اس کی برکت سے مجھے اس آنکھ میں ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔''[۱۱]

غزوۂ احد میں ایک نازک موقع پر جو صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوگئے تھے اور انھوں نے اپنے جسموں کو آپؐ کے لیے ڈھال بنا دیا تھا، ان میں حضرت قتادہ بن النعمانؓ بھی تھے۔ انھیں ایک تیر آ کر لگا جس سے ان کی آنکھ باہر آ گئی۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، میری آنکھ ٹھیک ہو جانے کی دعا کر دیجیے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اگر چاہو تو صبر کرو، اس کے بدلے تمھیں جنت ملے گی اور چاہو تو میں تمہارے حق میں اللہ سے دعا کروں کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، جنت بہترین بدلہ اور گراں قدر عطیۂ الٰہی ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ عورتیں مجھے کانا کہیں گی۔ آپ میرے لیے جنت کی بھی دعا فرمائیے اور آنکھ ٹھیک ہو جانے کی بھی۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ ''اللہ کے رسول ﷺ نے میرے لیے دونوں چیزوں کی دعا کی اور میری آنکھ ٹھیک ہوگئی۔''[۱۳]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی حادثہ کے نتیجے میں کوئی عیب پیدا ہو جائے تو اس کے معاملے میں جسمانی اذیّت کی طرح ذہنی اور نفسیاتی اذیّت کا بھی لحاظ کیا جائے گا، چنانچہ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے چیچک کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں ہو گئے ہوں، چہرہ پر کوئی گہرا زخم لگا، جس کے

ٹھیک ہوجانے کے بعد بھی نشانات باقی رہ گئے ہوں، کسی بدمعاش نے چہرے پر تیزاب پھینک دیا، جس کی وجہ سے وہ جھلس کر بدنما ہوگیا ہو، کینسر کی وجہ سے کسی خاتون کا پستان کاٹ کر نکال دیا گیا ہو، ان تمام صورتوں میں مذکورہ بدہیئتی کو دور کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کی اجازت ہوگی۔

۳۔ بعض جسمانی ہیئتوں کی تبدیلی

اللہ تعالی نے انسانوں کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ سب کو ایک شکل وصورت نہیں عطا کی ہے۔ کسی کو کالا بنایا ہے تو کسی کو گورا، کسی کو موٹا بنایا ہے تو کسی کو دبلا، کسی کی ناک اٹھی ہوئی ہے تو کسی کی پچکی ہوئی، کسی کی ٹھڈّی ابھری ہوئی ہے تو کسی کی دھنسی ہوئی، کسی کے کولہے بھاری بھرکم ہیں تو کسی کے دبلے، کسی کا سینہ زیادہ چوڑا ہے تو کسی کا کم۔ عموماً یہ معمولی فرق اعضاء کے مفوّضہ افعال کی انجام دہی میں بالکل حارج نہیں ہوتے اور انھیں عام قانون فطرت کے خلاف بھی نہیں تصوّر کیا جاتا۔ البتہ ان میں سے بعض ہیئتوں کو پسندیدہ خیال کیا جاتا اور انھیں خوب صورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور بعض ہیئتوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مذکورہ ہیئتوں میں تبدیلی کی جاسکتی ہے اور اپنے جسم کو من چاہی ہیئت میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تکنیک سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے اور اس نے ایک زبردست منافع بخش کاروبار کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت اس رجحان کو کس نظر سے دیکھتی اور اس کے بارے میں کیا حکم لگاتی ہے؟

انسان کا جسم اس کے پاس اللہ تعالی کی امانت ہے۔ اللہ نے اعضائے انسانی سے مختلف منفعتیں وابستہ کررکھی ہیں اور انھیں مخصوص کاموں میں لگادیا ہے۔ قرآن کریم میں مختلف اعضاء مثلاً آنکھ، کان، زبان، ہونٹ، ہاتھ، پیر، دل، دماغ وغیرہ کا تذکرہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور انسانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ ان نعمتوں پر اللہ تعالی کا شکر ادا کریں اور صرف اسی کی عبادت کریں جس نے انھیں ان بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے۔ اگر وہ اس کی ناشکری کریں گے اور شرک میں مبتلا ہوں گے تو روز قیامت ان

سے باز پرس کی جائے گی۔[۱۳]

اس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ انسان اپنے اعضائے جسم کا مالک نہیں ہے کہ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے، بلکہ اسے صرف انھیں ان کے مفوّضہ کاموں میں استعمال کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اپنے اعضائے جسم کی ہیئتوں میں من مانی تبدیلیاں لانے کے لیے پلاسٹک سرجری کراتے یا کرانا چاہتے ہیں، گویا وہ خود کو اپنے جسم وجان کا مالک ومختار تصور کرتے ہیں اور اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنی جن پسندیدہ ہیئتوں میں ڈھالنا چاہیں ڈھال لیں۔ یہ تصور صحیح اسلامی تصور کے مغایر ہے، اس لیے شرعی نقطۂ نظر سے اسے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس سے صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے اور وہ یہ کہ کسی عضو کی کوئی ہیئت عام قانونِ فطرت کے خلاف ہو، یا اس سے اس کے مفوّضہ کاموں کی انجام دہی میں دشواری یا رکاوٹ آرہی ہو۔ مثلاً کسی شخص کے دانت بہت زیادہ باہر کی طرف نکلے ہوئے ہوں، جس سے منہ ٹھیک طریقے سے بند نہ ہوتا ہو، یا کھانا صحیح طریقے سے چبایا نہ جاتا ہو، یا چہرہ بدنما معلوم ہوتا ہو۔ اس کا شمار بیماری میں ہوگا اور پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کی درستگی کی اجازت ہوگی۔

۴۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ظاہر ہونے والی ہیئتیں

انسان اپنی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ وہ ایک مختصر اور نحیف جسم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ پرورش وپرداخت کے نتیجے میں اس کے اعضاء کا حجم بڑھتا ہے۔ ان میں طاقت اور چستی پیدا ہوتی ہے، یہاں تک کہ جوانی میں وہ ہر پہلو سے مکمل ہوجاتے ہیں۔ پھر ان کا انحطاط شروع ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے اور چستی کی جگہ ڈھیلا پن بڑھنے لگتا ہے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں وہ کم زوری اور بے بسی کی اسی حالت کو پہنچ جاتا ہے، جس سے اپنے بچپن میں دوچار تھا۔ یہ قانونِ فطرت ہے جس سے ہر انسان کا سابقہ پیش آتا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ان مراحل حیات کا تذکرہ آیا ہے۔[۱۴]

عمر بڑھنے کے ساتھ انسانی اعضاء کی ہیئتوں میں ہونے والی تبدیلیاں فطری ہیں۔ ان تبدیلیوں کو روکنے یا ان اعضاء کی ہیئتوں کو من پسند ہیئتوں میں بدلوانے کی کوشش کرنا فطرت سے بغاوت کے مترادف ہے۔ یہ اللہ کی خلقت میں تبدیلی ہے جسے شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔اس بنا پر خواتین کا بڑھاپے کے نتیجے میں پستانوں میں پیدا ہونے والے ڈھیلے پن یا ہاتھوں اور چہرہ پر ظاہر ہونے والی جھرّیوں کو دور کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا اسلامی شریعت کی رو سے جائز نہ ہوگا۔البتہ اگر کسی شدید بیماری کی وجہ سے جوانی میں یہ عوارض ظاہر ہوگئے ہوں اور دواؤں سے انھیں دور نہ کیا جاسکتا ہو، ان کے ازالہ کی واحد صورت پلاسٹک سرجری ہو تو اس صورت میں اس تکنیک سے فائدہ اٹھا کر ان عوارض کو دور کرنے کی اجازت ہوگی۔

۵۔ کم عمر یا خوب صورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا

انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوب صورت دکھائی دے اور اس کا ظاہر دوسرے انسانوں کی نگاہ میں بھلا معلوم دے۔اس کے لیے وہ مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔شریعت نے نہ صرف اس کا اعتبار کیا ہے بلکہ اس کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور انسانوں کو زیب و زینت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ (الاعراف:۳۱)	اے بنی آدم، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔

ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے صحابۂ کرام کو غرور و تکبر کے برے انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبّر ہو'' یہ سن کر ایک شخص نے دریافت کیا: آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (کیا اس کا شمار بھی تکبّر میں ہوگا؟) آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ جمیل یحب الجمال، الکبر بطر الحق و غمط الناس [۱۵]	اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے (ظاہری زیب و زینت اختیار کرنا تکبر نہیں ہے) تکبر یہ ہے کہ حق کو ٹھکرایا جائے اور دوسروں کو حقیر سمجھا جائے۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے بال پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے بالوں کو درست کرلے۔'' اسی طرح آپؐ نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھا تو فرمایا ''کیا اسے کوئی چیز نہیں ملتی جس سے اپنے کپڑے دھولے؟[۱۶]

لیکن خوب صورتی اختیار کرنے کی تدابیر کو شریعت نے حدود کا پابند بنایا ہے۔ اس کے نزدیک حسن و جمال میں اضافہ کے لیے خارجی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں، لیکن جسم کے اعضاء یا ان کی ہیئتوں میں کوئی تبدیلی کرانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں ایسی کئی چیزوں سے صراحت کے ساتھ روکا گیا ہے جو صدرِ اسلام میں عربوں کے درمیان حسن و جمال میں اضافہ کے لیے رائج اور معروف تھیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

لعن رسول الله ﷺ الواشمات الموتشمات والمتنمّصات والمتفلّجات للحسن المغيّرات.[۱۷]

اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے ان عورتوں پر جو (جسموں پر) گودتی ہیں اور گودواتی ہیں، اور بھوں کے بال اکھیڑتی ہیں اور خوب صورتی کے لیے دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ عورتیں (اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں) تبدیلی کرنے والی ہیں۔

محدثین نے صراحت کی ہے کہ یہ کام عرب میں عورتیں حسن میں اضافہ کے لیے انجام دیتی تھیں۔ ان کے ذریعے بڑی عمر کی عورتیں جوان عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

امام نوویؒ (۶۷۶ھ) نے لکھا ہے:

''فلج کے معنی ہیں ثنایا اور رباعیات نامی دانتوں کے درمیان فاصلہ ہونا۔ متفلّجات سے مراد وہ عورتیں ہیں جو ان دانتوں کو گھس کر ان کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ کام بوڑھی اور بڑی عمر کی عورتیں کرتی تھیں، تاکہ وہ کم عمر دکھائی دیں اور ان کے دانت خوب

صورت لگیں۔ دانتوں کے درمیان معمولی فاصلہ فطری طور پر چھوٹی بچیوں میں ہوتا ہے۔ جب عورت بوڑھی ہوجاتی ہے، اس کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے اور اس کے دانتوں میں یہ فاصلہ باقی نہیں رہتا تو وہ انھیں ریتی سے گھستی ہے، تاکہ ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہوجائے، وہ خوب صورت دکھائی دینے لگے اور دوسرے اسے دیکھ کر کم عمر سمجھیں''۱۸؎

حافظ ابن حجرؒ (م۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

''متفلجات سے مراد وہ عورتیں ہیں جو ثنایا اور رباعیات نامی دانتوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی تھیں۔ عورت اس کو حسن کی علامت سمجھتی تھی۔ یہ کام وہ عورت کرتی تھی جس کے دانت ملے ہوئے ہوتے تھے، تاکہ ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہوجائے۔ بسا اوقات ایسا بڑی عمر کی عورت کرتی تھی، تاکہ دوسرے اسے دیکھ کر کم عمر سمجھیں، کیوں کہ کم عمر عورت کے دانت اکثر الگ الگ اور چمک دار ہوتے ہیں۔ بڑی ہونے پر اس کے دانتوں میں یہ خاصیت باقی نہیں رہتی''۱۹؎

مذکورہ بالا حدیث میں المتفلجات کے ساتھ للحسن بھی مذکور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ افعال اس صورت میں مذموم ہیں جب انھیں حسن میں اضافہ کے مقصد سے انجام دیا جائے، لیکن اگر ان کا سبب کوئی دوسرا ہو تو ان کی ممانعت نہ ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی تشریح مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

لُعنت الواصلة والمستوصلة والنامصة والمتنمّصة والواشمة والمستوشمة من غير داء.۲۰؎

بالوں میں بال جوڑنے والی، بھوں کے بال اکھیڑنے والی اور اکھڑوانے والی، جسم پر گودنے والی اور گودوانے والی پر لعنت کی گئی ہے، اس صورت میں جب یہ کام بغیر کسی مرض کے انجام دیے جائیں

محدثین نے بھی صراحت کی ہے کہ یہ کام اسی صورت میں مذموم ہیں جب انھیں حسن میں اضافہ کے لیے انجام دیا جائے۔ علاج معالجہ کے مقصد سے ان کی انجام دہی

میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

''حدیث کے الفاظ ہیں المتفلجات للحسن اس سے یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ قابل مذمّت وہ عورت ہے جو اس کام کو حسن میں اضافہ کے مقصد سے کرے، لیکن اگر اسے اس کی ضرورت کسی اور مقصد سے، مثلاً علاج کے لیے پیش آئے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔''[۲۱]

علامہ عینیؒ (م ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

''للحسن میں لام علّت کا ہے۔ (یعنی مذمّت اس صورت میں ہے جب اسے حسن میں اضافہ کے لیے کیا جائے۔) اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جس میں وہ کام علاج معالجہ یا اس جیسی کسی اور ضرورت سے انجام دیا جائے''[۲۲]

شریعت میں یہ کام کیوں ممنوع قرار دیے گئے ہیں؟ علماء نے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

''سببِ نہی کے سلسلے میں متعدد اقوال ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے اس وجہ سے روکا گیا ہے، کیوں کہ یہ دھوکہ (تدلیس) کے قبیل سے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تبدیلی ہے۔ یہ قول حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے۔ اس میں اول الذکر قول بھی شامل ہے''[۲۳]

امام نوویؒ نے لکھا ہے:

''مذکورہ احادیث میں اس فعل کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تبدیلی ہے 'تدلیس' (دھوکہ) ہے 'تزویر' (فریب) ہے۔''[۲۴]

مذکورہ بالا حدیث میں المتنمّصات (بھوں کے بال اکھیڑنے والی عورتوں) پر

بھی لعنت کی گئی ہے۔ یہ ممانعت بھی اسی صورت میں ہے جب یہ کام محض فیشن اور اضافۂ حسن کے مقصد سے کیا جائے ،لیکن اگر عورت کے چہرے پر غیر ضروری بال اگ آئیں تو وہ انھیں زینت اختیار کرنے کے مقصد سے اکھیڑ سکتی ہے۔ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا: اے ام المومنین ،میرے چہرے پر کچھ بال اگ آئے ہیں۔کیا میں اپنے شوہر کے لیے زینت اختیار کرنے کے مقصد سے انھیں اکھیڑ سکتی ہوں؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''اس تکلیف دہ چیز کو اپنے جسم سے الگ کردو''۔۲۵

فقہائے کرام نے بھی صراحت کی ہے کہ اگر عورت کے چہرے پر غیر طبعی طور سے بال اگ آئیں تو وہ انھیں بلا کراہت صاف کرسکتی ہے۔

علامہ ابن عابدین حنفیؒ (م۱۲۵۲ھ) فرماتے ہیں:

> ''بال اکھیڑنے کی ممانعت اس پر محمول ہے کہ عورت اس کام کو غیروں کے لیے زینت اختیار کرنے کے مقصد سے انجام دے، ورنہ اگر اس کے چہرے پر کچھ بال ہوں جن سے اس کے شوہر کو تنفّر ہوتا ہو،تو ان کے ازالہ کو ممنوع قرار دینا صحیح نہیں۔اس لیے کہ عورتوں کا زینت اختیار کرنا مطلوب ہے..... چہرے کے بالوں کو صاف کرنا حرام ہے،لیکن اگر عورت کے چہرے پر داڑھی یا مونچھ اگ آئے تو اسے صاف کرانا ممنوع نہیں، بلکہ مستحب ہے۔''۲۶

مالکیہ نے بھی صراحت کی ہے کہ جن (غیر ضروری) بالوں کو صاف کرنے میں عورت کا حسن ہو انھیں صاف کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر عورت کو داڑھی اگ آئے تو وہ اسے صاف کرے گی اور جن بالوں کو باقی رکھنے میں اس کا حسن ہے انھیں باقی رکھے گی۔شوافع کہتے ہیں کہ اگر شوہر عورت کو جسم کے غیر ضروری بال صاف کرنے کا حکم دے تو اس کے لیے ایسا کرنا واجب ہے۔۲۷

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ (م۶۲۰ھ) نے لکھا ہے: ''امام ابوعبداللہ (احمد بن حنبلؒ) سے چہرے کے بال صاف کرانے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:

عورتوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ مردوں کے لیے مکروہ ہے۔'' ۲۸

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کم عمر لگنے یا حسن و جمال میں اضافہ کے مقصد سے پلاسٹک سرجری کرانا اسلامی شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ حسن و جمال کا ایک اوسط معیار ہے۔ کوئی عورت اس معیار سے اپنے آپ کو فروتر پائے اور اس کی بدصورتی و بدہیئتی نمایاں ہو تو وہ اوسط معیار تک پہنچنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرا سکتی ہے۔ لیکن حسن و جمال کے اعلیٰ اور اپنے پسندیدہ میعار تک پہنچنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا شریعت کی نگاہ میں مطلوب و مستحب نہیں ہے۔

۶۔ شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانا:

بسا اوقات انسان کو کسی وجہ سے حکم رانوں کے مظالم کا شکار ہونے کا شدید اندیشہ رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کی گرفت میں نہ آئے، ورنہ وہ اسے ناقابل برداشت اذیتوں سے دوچار کریں گے۔ کیا ایسی صورت میں اسے اپنی شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانے کی اجازت ہوگی؟ اسلامی شریعت کی مجموعی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جھوٹ، مکر و فریب اور دھوکہ دہی کو ناپسندیدہ کاموں میں شمار کیا گیا ہے اور ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسلام کا عمومی مزاج یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ کوئی بھی فرد اسی طرح دکھائی دے جس طرح وہ حقیقت میں ہے۔ بہروپیا بننا اور سوانگ بھرنا اس کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول، میری ایک سوکن ہے۔ کیا میرے اوپر گناہ ہوگا اگر میں اس کے سامنے یہ اظہار کروں کہ میرے شوہر نے مجھے فلاں فلاں چیزیں دی ہیں، حالاں کہ حقیقت میں اس نے وہ چیزیں نہ دی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا:

المتشبّع بمالم یعط کلابس ثوبی زورٍ ۲۹

جسے کوئی چیز حاصل نہ ہو اور وہ اس کے حاصل ہونے کا اظہار کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو جھوٹ و فریب کے کپڑے پہنے ہوئے ہو۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی حق پر ثابت قدم رہے اور اس راہ میں جو کچھ آلام و مصائب آئیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ اس پر وہ بارگاہ الٰہی میں اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔شریعت نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر تکالیف اس کے لیے نا قابل برداشت ہوں تو وہ خلاف حقیقت بات زبان پر لاسکتا ہے۔(آل عمران: ۲۸، النحل:۱۰۶) شریعت اس کی بھی اجازت دیتی ہے کہ ظلم وتعدّی سے بچنے کے لیے وہ راہِ فرار اختیار کرسکتا اور کہیں چھپ سکتا ہے۔صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوبصیرؓ اور مکہ میں رہنے والے دیگر متعدد مسلمانوں نے اہل مکہ کی گرفت سے بچنے کے لیے ایک مقام پر پناہ لے لی تھی۳۰؎ لیکن شناخت چھپانے کے لیے پلاسٹک سرجری کروانے میں متعدد اسبابِ نہی جمع ہیں۔اس میں تزویر (فریب) وتدلیس (دھوکہ) کے ساتھ اللہ کی خلقت میں تبدیلی بھی ہے،اس لئے اسے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

خلاصۂ بحث

گزشتہ صفحات میں کی گئی پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پلاسٹک سرجری کی وہ تمام صورتیں جائز ہیں جو علاج معالجہ کے قبیل سے ہیں۔ان کے علاوہ دیگر صورتیں (مثلاً کم عمر دکھائی دینے،حسن وجمال میں اضافہ کرنے یا شناخت چھپانے کے مقصد سے پلاسٹک سرجری کرانا) جائز نہیں ہیں۔

حواشی ومراجع

۱ اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Santoni-Rugiu, Paolo. A History of Plastic Surgery, Springer, 2007

Haiken, Elizabeth. Venus Envy: A History of Cosmetic Surgery. Johns Hopkins University Press, 1997

۲ جامع الترمذی، ابواب الطب، باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ، ۲۰۳۸،سنن ابی داؤد،کتاب الطب ،باب فی الرجل یتداوی ، ۳۸۵۵، اس مضمون کی مزید احادیث

کے لیے ملاحظہ کیجئے موطاامام مالک :۳۹۹۶، بخاری: ۵۶۷۸، مسلم:۲۲۰۴، مسند احمد:۱/ ۳۷۷،۴۱۳، ۴/ ۲۷۸، ۳۲۷، ۵/ ۲۰۱،۳۷۱

۳ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب المتشبھون بالنساء والمتشبھات بالرجال، ۵۸۸۵، مزید ملاحظہ کیجئے بخاری:۵۸۸۶، ۶۸۳۴، ابوداؤد:۴۰۹۷، ۴۰۹۹، ترمذی:۲۷۸۴، ابن ماجہ:۱۹۰۴

۴ اس آیت میں 'تغیر خلق اللہ' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی خلقت میں تبدیلی ہے۔ تمام اقوال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: کتب تفسیر میں متعلقہ آیت کی تفسیر

۵ قرطبی، الجامع الاحکام القرآن، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۸۷ء، ۵/ ۳۹۳

۶ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دارالمعرفۃ بیروت، ۱۰/ ۳۷۷۔

۷ ابن حجر، ۱۰/ ۳۷۷، قرطبی، ۵/ ۳۹۳

۸ الفتاوی العالمکیریۃ (الفتاوی الھندیۃ) المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، بولاق مصر ۱۲۱۰ھ، ۵/ ۳۶۰

۹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب، ۴۱۲۲

۱۰ سنن ابی داؤد، کتاب الخاتم، باب ماجاء فی ربط الاسنان بالذھب، ۴۲۳۲، مزید ملاحظہ کیجئے ترمذی:۱۷۷۰، نسائی:۵۱۶۱، ۵۱۶۲۔ علامہ البانیؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

۱۱ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دارالریان للتراث القاہرۃ، ۱۹۸۸ء، ۳/ ۲۹۲، بہ حوالہ طبرانی

۱۲ علی بن برہان الدین الحلبی، انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیۃ، المکتبۃ الاسلامیۃ، بیروت، ۲/ ۲۵۲

۱۳ ملاحظہ کیجئے آیات :الانعام :۴۶، الاعراف:۱۷۹، ۱۹۵، النور:۲۴، الحج : ۴۶، یس:۳۵، ۶۵، ق:۳۷، البلد:۸۔۹ وغیرہ۔

۱۴ ملاحظہ کیجئے،النحل:۷۰،الحج:۵، الروم:۵۴،یٰسٓ:۶۸،المومن:۶۷

۱۵ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ،۹۱

۱۶ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی غسل الثوب وفی الخلقان۴۰۶۲

۱۷ سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب المتنمّصات،۵۰۹۹،سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الواصلۃ والواشمۃ،۱۹۸۹۔علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔سنن نسائی میں کچھ اور روایتیں ہیں جن میں حضرت عبداللہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سننے کی صراحت کی ہے (۵۱۰۷، ۵۱۰۸،۵۱۰۹)علامہ البانیؒ نے ان روایتوں کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔صحیح بخاری کی ایک روایت (۵۹۳۹)میں حضرت علقمہؒ سے مروی ہے کہ ''حضرت عبداللہ نے لعنت کی ہے.....''اور دیگر متعدد روایتوں میں حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ نے لعنت کی ہے.....''(ملاحظہ کیجئے بخاری:۴۸۸۶،۵۹۳۱،۵۹۳۹،۵۹۴۳،۵۹۴۸،مسلم:۲۱۲۵،ابوداؤد: ۴۱۶۹،ترمذی:۲۷۸۲،دارمی:۲۶۴۷،احمد،۱/۴۳۴،۴۴۳،۴۵۴

۱۸ نووی،شرح صحیح مسلم،دارالریان للتراث القاہرۃ ۱۹۸۷ء،۱۴/۱۰۶۔۱۰۷

۱۹ فتح الباری،۱۰/۳۷۲

۲۰ سنن ابی داؤد، کتاب الترجل، باب صلۃ الشعر،۴۱۷۰

۲۱ فتح الباری،۱۰/۳۷۲۔۳۷۳

۲۲ بدرالدین عینی،عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری،مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر۱۹۷۲ء،۸۱/ ۹۵

۲۳ قرطبی،الجامع لاحکام القرآن،۵/۵۹۳

۲۴ شرح مسلم نووی،۱۴/ ۱۰۷

۲۵ عبدالرزاق ،المصنف ،تحقیق وتخریج: حبیب الرحمٰن الاعظمی ،المکتب الاسلامی بیروت ۱۹۸۳ء،۳/ ۱۴۶

۲۶ ابن عابدین،ردالمحتار علی الدرالمختار،مطبع درسعادت،مصر،۵/ ۳۲۸

۲۷ الفواکہ الدوانی، ۲/ ۴۰۱، حاشیہ القلیوبی، ۳/ ۲۵۲ بحوالہ الموسوعۃ الفقھیۃ الکویت، ۲۱/ ۲۷۳-۲۷۴

۲۸ ابن قدامۃ، المغنی، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ الریاض ۱۹۸۱، ۱/ ۹۱

۲۹ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المتشبع بمالم ینل، ۵۲۱۹، صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب النھی عن التزویر فی اللباس، ۲۱۳۰

۳۰ ابن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، ۱۹۳۷ء، ۳/ ۳۷۲-۳۷۳

قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب (یہود و نصاری) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات، ان کی بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اہلِ کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا مقصد کیا ہے؟ اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت و نصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟ اور اس سے انہیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ اس کتاب میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری کا مبسوط مقدّمہ بھی ہے۔

عمدہ کاغذ، آفسیٹ کی حسین طباعت، دیدہ زیب سرورق، صفحات: ۲۹۶ قیمت =/۷۰ روپے

≐ ملنے کے پتے ≐

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

عصر حاضر کے مسائل اور ان کا حل
(کتاب وسنت کی روشنی میں)

پروفیسر عبدالرؤف ظفر

آج کا انسان بے شمار مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ یہ مسائل معاشی بھی ہیں، سیاسی بھی اور اخلاقی بھی۔ کہیں انفرادی مسائل ہیں تو کہیں اجتماعی۔ قومی مسائل بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور کا انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور چاند پر اپنا قدم جمانے کے باوجود گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ معاشی اور معاشرتی مسائل میں بڑھتی ہوئی آبادی، ناخواندگی اور جہالت، بے روزگاری، بیماری، مہنگائی، معاشی بدحالی اور ناہمواریاں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح طبقاتی کشمکش، نسلی امتیاز، آزادئ نسواں کا مسئلہ، عائلی نظام میں شکست وریخت کا عمل، منشیات کا استعمال، شراب نوشی، لاقانونیت، ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کا جنون، مذہب سے دوری ومعاشرتی بے راہ روی، الحاد ودہریت، معاشرتی بدحالی اور بدامنی، بین الاقوامی بدنظمی، بے حیائی اور مغرب کی اندھی تقلید پریشان کن مسائل ہیں۔ عصرِ جدید کے ان تمام مسائل کا حل اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں موجود ہے۔ اللہ کی کتاب قرآن مجید کے بارے میں کہا گیا ہے:

إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يِهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَمُ (الاسراء-۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ سیرت ایک مکمل دستور حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)

تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

آیئے دیکھیں کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ مبارکہ میں ان مسائل کا کیا حل ہے؟

۱- آبادی میں اضافہ

جدید دور کا سب سے اہم مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ تیسری دنیا میں اب اس اضافہ کی شرح تین فی صد سالانہ ہے جس کی وجہ سے ہر سال تقریباً ۵ ۷ ملین افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ روزگار اور بہتر معیار زندگی کے لیے شہروں کی طرف نقل مکانی کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ۲۰۳۰ء تک شہری اور دیہی آبادی میں تناسب بالکل بدل جائے گا۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ کے حل کے سلسلے میں جب ہم کتاب وسنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اولاد کو اس اندیشہ سے قتل نہ کیا جائے کہ وہ رزق میں حصّہ دار ہو جائیں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا (الاسراء:۳۱)	اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔

اسلام آبادی میں اضافہ کے مسئلے کا حقیقی حل اضافہ پیداوار کی شکل میں تجویز کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (الاعراف:۱۰)	ہم نے تم کو زمین میں قدرت دی اور اس میں تمھارے وسائل معیشت بنائے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''رزق کا دروازہ عرش تک کھلا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں''۔[۱]

انسانی آبادی رحمت ہے، اگر اسے صحیح سمت میں لگایا جائے اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو اضافۂ آبادی مسئلہ نہیں بلکہ Man Power کے طور پر انسانی ترقی کے لیے نفع بخش ہوسکتا ہے۔ زمین انسان کا مسکن ہے:

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِيْنٍ (البقرۃ:۳۶)	اور تمھارے لیے زمین میں ٹھہرنا ہے اور کچھ وقت کے لیے فائدہ اٹھانا ہے۔

رزق مہیا کرنا اللہ کے ذمے ہے: ارشادِ خداوندی ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا. (الزخرف:۳۲) (ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کو تقسیم کر دیا)۔

ان آیات کریمہ اور احادیث نبوی ﷺ کے حوالے سے انسانی آبادی میں اضافہ اس وقت باعث تشویش ہوگا جب لوگ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تقدیر کے منتظر ہوں گے، ورنہ قدرت نے جو وسائل معیشت رکھے ہیں، عقل سے کام لے کر ان کے استعمال کرنے سے یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔

۲- ناخواندگی اور جہالت

جہالت کا خاتمہ اور تعلیم کا فروغ عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے، کیونکہ عالم اسلام سائنسی میدان اور تعلیم کی دنیا میں اقوام عالم سے بہت پیچھے ہے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہم ناخواندگی کی تاریکی کو علم کی روشنی میں کیسے تبدیل کریں؟ تاکہ ہم بھی مغربی اقوام کی طرح ترقی کی منازل طے کر سکیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فروغ تعلیم سے متعلق ارشاد فرمایا: "طلب العلم فريضة على كل مسلم"[۲] (علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود نبی اکرم ﷺ کو طلب علم کی دعا کی تلقین کی گئی ہے: قُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (طہ:۱۱۴) (کہیے! اے میرے رب مجھے زیادہ علم عنایت فرما)۔

اہلِ علم کو اللہ کے ہاں زیادہ عزت دے کر ان کی برتری کا اظہار قرآن میں یوں کیا گیا ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر:۹) (کہہ دیجئے! کیا اہل علم اور وہ جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں)۔

علم سے ہی اللہ کے قانون اور ضابطے کی صحیح پہچان ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر:۲۸) (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں)۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: "خيركم من تعلّم القرآن وعلّمه"[۳] (تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے)۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انما بُعثت معلّما'' ۴ (مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے)۔ مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے گھر میں، پھر دار ارقم اور شعب ابی طالب میں تعلیم دین کا سلسلہ قائم رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر بھی علمی مرکز تھا۔ بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد آپؐ نے مدینہ کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر روانہ فرمایا کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ ۵ مدینہ میں مسجد نبوی کے اندر صفہ کی درس گاہ تھی۔ اسی طرح دیگر مساجد میں بھی تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری تھا جن میں سے مسجد قبا کا ذکر ابن عبدالبر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''حدثنی عشر من اصحاب رسول اللہ ﷺ قالوا کنا نتدارس العلم فی مسجد قبا اذ خرج علینا رسول اللہ فقال: تعلّموا ما شئتم ان تعلّموا فلن یأجرکم اللہ حتی تعملوا'' ۶	نبی ﷺ کے دسیوں صحابہ رضی اللہ عنہم نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم لوگ مسجد قبا میں علم دین سیکھتے اور پڑھتے پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ ہمارے پاس آئے اور فرمایا: جو چاہو تم لوگ پڑھو جب تک عمل نہیں کرو گے اللہ اجر وثواب نہیں دے گا۔

مسجد نبوی کا وہ ستون جس سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے ایک معاملے میں خود کو مجرم سمجھ کر اپنے آپ کو باندھ لیا تھا، یہاں تک کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی، نبی ﷺ اس کے پاس اکثر نوافل پڑھا کرتے تھے اور یہیں صبح کی نماز کے بعد تعلیمی مجالس قائم فرماتے اور اپنے اصحاب کو دین کی تعلیم دیتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر ادا فرما لیتے تو ہم لوگ آپؐ کے پاس بیٹھ جاتے اور ہم میں سے کوئی آپؐ سے قرآن کے بارے میں سوال کرتا، کوئی فرائض کے بارے میں دریافت کرتا اور کوئی خواب کی تعبیر معلوم کرتا تھا۔ ۷

عہد نبوی ﷺ میں گھر گھر قرآن حکیم کی تعلیم کا رواج ہو گیا تھا۔ گھریلو مکاتب قائم ہو گئے تھے۔ صحابۂ کرام، ان کی بیویاں، بیٹے، پوتے وغیرہ قرآن سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ نبی ﷺ نے مستقبل میں علم دین اٹھ جانے کی بات کہی تو حضرت زیاد بن لبید انصاری بیاضی رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کیا:

كيف يختلس منا وقد قرأنا القرآن فو الله لنقرأنه نساء نا وأبناء نا ۸	علم ہم سے کیسے اٹھالیا جائے گا حالانکہ ہم نے قرآن پڑھ لیا ہے۔ خدا کی قسم، ہم اپنی عورتوں کو پڑھائیں گے اور اپنے بیٹوں کو پڑھائیں گے۔

اس سے مدینہ میں قرآن اور دینی تعلیم کے لیے گھریلو مدارس کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نبی ﷺ نے تعلیم و تعلّم کا اہتمام اگرچہ مکہ میں بھی کیا تھا، لیکن مدینہ پہنچ کر تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں میں عربی لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس زمانہ میں عربی رسم الخط اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ اسی وجہ سے اس کا سیکھنا بے حد مشکل تھا۔ جنگ بدر میں جب قریش کے ستّر سرکردہ افراد گرفتار ہو کر آئے تو پتہ چلا کہ ان میں سے چند ایسے قیدی بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ نبی ﷺ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان کے لیے شرط مقرر کی کہ اگر ان میں سے ہر قیدی مدینہ منورہ کے دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو انہیں رہا کر دیا جائے گا اور یہ تعلیمی خدمت ہی ان کی رہائی کا سبب بن جائے گی۔ ۹

۳- جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام

عصرِ جدید کا ایک اہم مسئلہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ یہ طبقات سیاست اور ملکی وسائل پر قابض ہیں اور غریب محنت کش مزدور دو وقت کی روٹی کے لیے بھی پریشان ہے۔ اس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام نے دنیا کے تمام لوگوں کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے جس فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی اس میں سرمایہ داری کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپؐ نے کسب حلال کا حکم دیا، سود کی ممانعت فرمائی، جوئے، سٹے، ذخیرہ اندوزی، ناپ تول میں کمی، ناجائز منافع خوری کو حرام قرار دیا۔ رزق حلال کمانے کی ترغیب قرآن میں یوں دی گئی ہے: يَـآيُّهَـا النَّـاسُ كُـلُـواْ مِـمَّـا فِـىْ الأَرْضِ حَلاَلاً طَيِّبـاً

وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْن (البقرۃ:۱۶۸)(اے لوگو! زمین میں جو حلال پاکیزہ ہے اس سے کھاؤ اور شیطان کے نشانات کے پیچھے نہ چلو وہ تمھارا واضح دشمن ہے)۔ اسلام نے وہ تمام راستے بند کر دیے ہیں جو ناجائز ذرائع آمدنی کا سبب ہیں۔ سود کے متعلق ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُواْ اللّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُون (آل عمران:۱۳۰) اے ایمان والو! کئی گناہ کر کے سود نہ کھاؤ اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔

باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی ممانعت کی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (النساء:۲۹) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے)۔

زکوٰۃ کا فلسفہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ''تُوخذ من اغنیائھم وتُردّ الی فقرائھم'' [۱۰] (زکوٰۃ ان کے مال داروں سے لی جائے اور ان کے فقراء میں لوٹائی جائے)۔ رسول اللہ از خود کبھی کسی سائل کو خالی نہ لوٹاتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے مشرک آقا سے خرید کر آزاد کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ربحت تجارۃ ابی بکر'' [۱۱] (ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تجارت فائدہ مند ثابت ہوئی) اسلام میں امیر اور غریب آپس میں بھائی بھائی اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق کی تلقین کی گئی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ اہل مجلس میں دولت مندی اور دنیاوی خوشحالی کا کچھ تذکرہ کرنے لگے (کہ یہ چیز اچھی ہے یا بُری اور دین اور آخرت کے لیے مضر ہے یا مفید) تو آپؐ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے (اور اس کے احکام کی پابندی کرے) اس کے لیے مالداری میں کوئی مضائقہ نہیں اور کوئی حرج نہیں اور صحت مندی صاحبِ تقویٰ کے لیے دولت مندی سے بھی بہتر ہے اور خوش دِلی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے (جس پر شکر واجب ہے)۔ [۱۲]

۴-غربت

عصرِ جدید کا اسی سلسلے کا ایک سنگین مسئلہ غربت ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک نے تجارتی اور اقتصادی میدان میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، جس کی وجہ سے پس ماندہ ممالک اقتصادی طور پر کم زور ہو گئے ہیں۔ترقی یافتہ ممالک نہ تو پس ماندہ ممالک کی اشیاء خریدتے ہیں اور نہ دلی طور پر ان کی معاشی ترقی اور اقتصادی برتری دیکھنا چاہتے ہیں۔سودی نظام کی پابندیوں سے ان کی معاشی حالت مزید خراب ہوتی جارہی ہے، جبکہ ترقی یافتہ ممالک آپس میں ہی تجارت کو فروغ دیتے ہیں۔سیرت نبوی میں اس مسئلے کا حل موجود ہے۔نبی اکرم ﷺ نے ایک فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔نظامِ زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے غربت کا خاتمہ کیا اور معاشی طور پر ایک دوسرے کی مدد کو رواداری اور اخوت کا نام دیا۔اللہ نے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا نبی ﷺ کو حکم دیا: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (التوبۃ:۱۰۳) اے نبی تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ۔

سود کو اللہ نے اپنے اور رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے، کیونکہ غربت کی ایک وجہ سودی لین دین بھی ہے۔ارشاد فرمایا: يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ .فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِه (البقرۃ:۲۷۸-۲۷۹) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے)۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”الربا سبعون حوبًا أيسرها أن ينكح الرجل أمّه“ ۱۳ (سود کی ۷۰ سے زیادہ قسمیں ہیں، اس کی کم ترین قسم کی شناعت اتنی ہے کہ انسان اپنی ماں سے بدکاری کرے)۔رسول اللہ ﷺ نے جب سود کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ: میں سب سے پہلے اپنے چچا عباس کا سود معاف کرتا ہوں۔۱۴ اسی طرح آپؐ نے فرمایا: ”اقسموا المال بين اهل الفرائض على كتاب الله“ ۱۶

(مستحقینِ میراث میں کتاب اللہ کے مطابق مال تقسیم کرو)۔ اسلامی معاشرے میں ہر سطح پر گردش دولت کو ہی معاشرتی زندگی کا اصول قرار دیا گیا ہے اور صرف مال داروں کے درمیان اس کے محصور رہنے کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُم (الحشر:۷) (تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے)۔

اسی طرح اہل ایمان کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور احتیاج کے باوجود دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الحشر:۹) (اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں)۔ انھیں تلقین کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی شریک کریں۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (المعارج:۲۴-۲۵) (جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے غربت کے خاتمہ کے لیے متعدد عملی اقدامات کیے۔ ایک دفعہ ایک شخص کو آپ نے مانگتے ہوئے دیکھا تو اس کو بلا کر دریافت فرمایا: تمھارے گھر میں کوئی چیز ہے۔ اس نے کہا: ایک موٹا کمبل ہے جس کا کچھ حصّہ اوڑھ لیتا ہوں اور کچھ حصّہ بچھا لیتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس سے پانی پیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ دونوں چیزیں لے آؤ۔ جب وہ دونوں چیزیں لے آیا تو آپ نے انھیں اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ان دونوں چیزوں کو کون خریدنا چاہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا: میں انھیں ایک درہم میں خریدوں گا۔ آپؐ نے فرمایا کوئی ایک درہم سے زیادہ دے گا؟ ایک اور آدمی نے کہا: میں انھیں دو درہم میں خرید لوں گا۔ آپؐ نے وہ دونوں چیزیں دے کر اس سے دو درہم لیے اور مانگنے والے شخص کو دے کر فرمایا: ایک درہم سے غلّہ خرید کر اپنے گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ جب وہ اسے لایا تو آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا: جاؤ، جنگل میں اس سے لکڑیاں کاٹو اور بیچو۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: میں تمھیں پندرہ دن تک نہ دیکھوں۔ وہ آدمی چلا گیا اور لکڑیاں کاٹتا

اور بیچتا رہا، یہاں تک کہ پندرہ دن کے بعد وہ آیا تو اس کے پاس دس درہم تھے۔ اس نے کچھ درہم سے کپڑے اور کچھ سے غلّہ خریدا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ تمھارے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ مانگنے کی وجہ سے قیامت کے دن تمھارے چہرے پر سیاہی ہو۔[۱۶]

دورِ نبوی ﷺ میں مسلمان محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی دست سوال دراز کرنے کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ سب میں خودداری تھی، محنت کی فضا تھی۔

رسول اللہ ﷺ غرباء سے محبت کرتے تھے اور اُن میں بیٹھنا پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے "**ابغونی فی ضعفاء کم، فانما ترزقون او تنصرون بضعفاء کم**"[۱۷] (مجھے کم زوروں میں تلاش کرو، تمہیں کم زوروں کے سبب ہی رزق دیا جاتا ہے یا انہی کے سبب تمہاری مدد کی جاتی ہے) آپ دعا فرمایا کرتے تھے: "**اللھم احینی مسکینًا وامتنی مسکینًا واحشرنی فی زمرۃ المساکین یوم القیامۃ**"[۱۸] (اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں مجھے موت دے اور مجھے قیامت کے دن مسکینوں کے زمرے میں اٹھا)۔

۵- آزادیٔ نسواں

موجودہ تہذیب کا ایک نعرہ عورت کی آزادی، مساوات اور ترقی کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے، حالانکہ مغرب نے مساوات مرد و زن اور ترقی نسواں کے پُرفریب نعروں میں عورت کو گرفتار کر کے اسے زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے برابر بلکہ ان سے بھی آگے نکال دیا ہے۔ وہ اب صرف نائٹ کلبوں کی زینت ہی نہیں، بلکہ مردوں کی ہوس کا سامان بننے کے لیے پرسنل سکریٹری، ٹائپسٹ کے قدرے شائستہ روپ سے بڑھ کر ایئر ہوسٹس اور فوٹو گرافر تک نظر آتی ہیں۔ تشہیر کے لیے بھی عورت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں سکون کے بجائے ذہنی پریشانی اور نفرت کا دور دورہ ہے۔ جبکہ اسلام نے بحیثیت انسان مرد و زن کو برابر قرار دیا ہے۔ عقائد کے لحاظ سے بھی دونوں میں مساوات ہے، نیکی اور بدی کی جزا و سزا کے لحاظ سے دونوں یکساں ہیں۔ جرائم کی سزا کے لحاظ سے

بھی دونوں میں برابری ہے۔ ملکیت رکھنے کے لحاظ سے بھی ہر ایک کو اپنی ملکیت میں تصرف کی اجازت ہے۔ اسلام مرد اور عورت میں ان کی فطری صلاحیتوں، جسمانی ساخت اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے فرق کرتا ہے۔ وہ گھر کے تمام مالی امور مرد کے ذمہ قرار دیتا ہے اور نسل کی پرورش عورت کی ذمہ داری بتاتا ہے۔ جہاں تک عورت کی آزادی کا تعلق ہے، پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ میں بھی عورت کو اپنی بات کہنے کی آزادی تھی۔ ۱۹ چنانچہ قرآن کریم نے حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَکِیْ إِلَی اللَّهِ وَاللَّهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ (المجادلۃ:۱)

اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ حضرت اسماءؓ حاضر خدمت ہوئیں اور مندرجہ ذیل تقریر کی: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر میرے ماں باپ قربان! میں مسلمان عورتوں کی طرف سے یہ پیغام لے کر آئی ہوں کہ اللہ نے آپ کو مرد و زن دونوں کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ ہم سب آپؐ کے متبع ہیں اور آپؐ پر ایمان لائے ہیں، مگر ہم میں اور مردوں میں بڑا فرق ہے۔ ہم گھروں میں محصور ہیں اور اولاد کو پالتی ہیں اور مرد نماز جمعہ اور نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہیں، حج کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ ہم ان تمام معاملات میں مردوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ ہم ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، لباس کے لیے چرخہ کاتتی ہیں تو کیا ہم اجر و ثواب میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوں گی؟ ان کی تقریر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم لوگوں نے مذہب کے بارے کبھی کسی عورت سے ایسی گفتگو سنی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہمیں تو کبھی اس بات کا خیال تک نہ آیا کہ کوئی عورت ایسا سوال کر سکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی رضامندی، فرماں برداری اور موافقت کرتی ہے اور زوجیت کے فرائض ادا کرتی ہے تو اسے بھی مردوں کے برابر ثواب ملے گا۔ ۲۰

۶- مذہبی تعصب، بدامنی اور بین الاقوامی بدنظمی

بعثت نبوی کے وقت امن عالم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس وقت کی دو متمدن سلطنتیں روم اور فارس آپس میں برسرِ پیکار تھیں۔ بڑی طاقتوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے پورا عالمی امن تباہ تھا۔ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز تھی۔ معاشرہ میں طبقاتی کشمکش تھی۔ مختلف مذاہب کے پیروکار مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کے رجحانات رکھتے تھے۔ ہر طرف پریشانی کا عالم تھا۔ قرآن مجید نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم:۴۱) (خشکی اور تری میں فساد عام ہو گیا اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے کمایا) چنانچہ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ کے متعلق ارشاد فرمایا: قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ. يَهْدِي بِهِ اللّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلاَمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنِ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (المائدۃ:۱۵-۱۶) تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی راہ نمائی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے توحید کی دعوت دی جو کہ تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت تھی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُون (آل عمران:۶۴)

اے نبی ﷺ کہو "اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔

اسی طرح پیغمبر ﷺ نے دیگر تمام معاملات میں جن میں لوگوں کے درمیان اختلاف اور برتری کا جذبہ پایا جاتا تھا، مساوات کی تعلیم دی اور ہر طرح کے تفاوت کا خاتمہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُم (الحجرات:۱۳)

لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور حضور نبی کریم ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر، کسی عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے''۔[۲۱]

۷- دہشت گردی

قبل از اسلام عرب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بات بات پر جھگڑنا ان کا قومی شعار بن چکا تھا۔ پھر قبائلی رقابت اور نسلی تفاخر ان جھگڑوں کو مستقل جنگوں کی شکل میں تبدیل کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں 'ثأر' کا عقیدہ راسخ ہو چکا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک مقتول کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے، اس کی روح پرندے کی شکل اختیار کر کے مسلسل چیخ و پکار کرتی رہتی ہے کہ میں پیاسی ہوں اور یہ پیاس صرف قاتل یا اس کے قبیلے کے کسی فرد کا خون بہانے سے ہی بجھ سکتی ہے۔ اس عقیدے کے تحت اگر قبائل میں جنگ چھڑ جاتی تو بعض اوقات بیسیوں سال تک جاری رہتی تھی۔

دنیا سے فتنہ و فساد ختم کر کے اللہ کا دین قائم کرنے کی ذمہ داری ہی حقیقتاً وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو دنیا ظلم سے بھری ہوئی تھی۔ آپؐ نے اس عالمی دہشت گردی کو بڑے منظّم انداز سے ختم کیا۔ آپ نے بسا اوقات ایسے اقدامات کیے جن میں بظاہر تو اپنا نقصان معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کے نتائج بڑے اچھے انداز میں ظاہر ہوئے''۔[۲۲]

۸-شراب نوشی

شراب نوشی موجودہ دور کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پوری دنیا اس میں مبتلا ہے۔ اس مسئلہ کو بھی کتاب وسنت کی روشنی میں حل کیا جاسکتا ہے۔

شراب کا عرب میں اس قدر رواج تھا کہ ہر انسان اس میں مبتلا تھا۔ بچے اور عورتیں شراب پلانے پر مامور ہوتے، شراب خانے ممتاز مقامات پر سارا وقت کھلے رہتے اور پہچان کے لیے وہاں جھنڈے لہراتے رہتے تھے۔

شراب کی حرمت کا حکم تدریج کے ساتھ نازل ہوا۔ شروع میں اس کے نقصانات واضح کیے گئے۔ سورۂ بقرہ میں ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرۃ:۲۱۹) (وہ پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں)۔

ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نماز میں امامت کرتے ہوئے کچھ الفاظ غلط پڑھ گئے۔ اس کے بعد نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت کی گئی ہے: لاَ تَقْرَبُواْ الصَّلوٰةَ وَأَنتُمْ سُكٰرٰى (النساء:۴۳) (جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ)۔ پھر بھی لوگوں نے بالکلیہ شراب سے کنارہ کشی اختیار نہ کی اور نماز کے بعد شراب پیتے رہے۔ ایک مرتبہ چند انصار اور مہاجروں میں شراب نوشی کی حالت میں معمولی سی جھڑپ ہوگئی جو بڑھ کر سخت لڑائی تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد شراب نوشی بالکلیہ حرام کردی گئی: يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالأَنصَابُ وَالأَزْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُون (المائدۃ:۹۰) (اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی) یہ خبر سنتے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے پیالے اور شراب کے برتن توڑ ڈالے اور شراب مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہادی گئی اور یوں امت نے شراب کو خیر باد کہا''۔[۲۳]

حواشی ومراجع

۱ النسفی، ابوالبرکات، ابوعبداللہ بن احمد، کنز الدقائق (محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل، کراچی) ص ۴۱۵
۲ ابن ماجہ، السنن، ح ۲۲۴
۳ البخاری، الجامع الصحیح، ح ۵۰۲۷
۴ ابن ماجہ، السنن، ح ۲۲۹
۵ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام، ۱/ ۶۷
۶ ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، دارالفکر، بیروت، ۲/ ۸
۷ محمد بن محمد الفاسی، جمع الفوائد، المکتبہ الاسلامیہ سمندری فیصل آباد، ۱/ ۴۸
۸ ترمذی، السنن، ح ۲۶۵۳
۹ ابن کثیر، سیرت النبی ﷺ (اردو ترجمہ)، مکتبہ قدوسیہ لاہور، طبع اوّل ۱۹۹۶ء، ۱/ ۶۲۱
۱۰ البخاری، الجامع الصحیح، ح ۱۳۹۵
۱۱ مسلم، الجامع الصحیح، ح ۶۸۵۸
۱۲ ڈاکٹر عبدالحیٔ، اسوہ رسولِ اکرم ﷺ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص ۶۹
۱۳ ابن ماجہ، السنن، ح ۲۲۷۴
۱۴ ڈاکٹر نثار احمد، خطبہ حجۃ الوداع، انسٹی ٹیوٹ آف سیرت اسٹڈیز، کتاب سرائے، لاہور، ص ۱۸۶
۱۵ مسلم، الصحیح، کتاب الفرائض، ح ۱۶۱۵
۱۶ ابوداؤد، السنن، کتاب الزکوٰۃ، ح ۱۶۴۱
۱۷ ابوداؤد، السنن، کتاب الجہاد، ح ۱۷۰۲
۱۸ اترمذی، السنن، کتاب الزھد، ح ۲۳۵۲
۱۹ نعیم صدیقی، عورت معرض کشمکش میں، ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور، ص ۱۲۰-۱۲۱
۲۰ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، ابن عبدالبر، تذکرۃ اسماء بنت یزید بن السکن
۲۱ خطبہ حجۃ الوداع، ص ۹۶
۲۲ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، رسول اکرم بحیثیت سپہ سالار، مکتبہ السلام وسن پورہ لاہور، ص ۴۱-۴۴
۲۳ عبدالمجید، آخری نبی ﷺ اوران کی تعلیمات، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ص ۴۲۳

کاروکاری (قتلِ غیرت) کی رسم

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

جناب ارشد منیر لغاری

کاروکاری پاکستانی معاشرے میں مخصوص علاقے اور طبقے کی ایک رسم ہے، جسے مرد اور عورت کے ناجائز تعلق کے افشاء پر بطور سزا استعمال کیا جاتا ہے۔ عمومی طور پر اسے غیرت کے قتل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سندھی زبان کے دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کارو، کاری۔ کاروکا مطلب ہے بدکار مرد اور کاری کا مطلب بدکار عورت ہے۔[۱] یہ رسم پنجاب میں 'کالا کالی' بلوچستان میں 'سیہ کاری' اور سرحد میں 'تورتورہ' کے نام سے موسوم ہے۔ جب کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات میں ملوث پائی جائے، یا اس پر ناجائز تعلقات کا الزام عائد کر دیا جائے تو عورت اگر شادی شدہ ہے تو شوہر اور بیٹا اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو باپ، بھائی اور خونی رشتہ دار اس رسم کے تحت اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ غیرت کے دفاع میں مرد و عورت دونوں کو قتل کر دیں۔ رابعہ علی اس کی یہ تعریف بیان کرتی ہیں:

> ''سندھ میں غیرت کے نام پر ہونے والے قتل کے لئے استعمال کی جانے والی اصطلاح جس میں ملزم پر ناجائز تعلقات کا الزام لگایا جاتا ہے۔''[۲]

رسم ہذا میں عورت جسمانی لحاظ سے کم زور اور معاشرتی پہلو سے مجبور ہونے کی وجہ سے کوئی دفاعی قدم نہیں اٹھا پاتی اور قتل کا فوری نشانہ بن جاتی ہے، جب کہ مرد کبھی کبھی بچ نکلتا ہے، لیکن اس کی جان بخشی نہیں ہوتی۔ وہ 'کارو' قرار دے دیا جاتا ہے اور جب تک وہ متاثرہ پارٹی کے ساتھ صلح / معاہدہ وغیرہ نہیں کرتا، موت کی تلوار اس کے سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ ایک وقت میں اس رسم کا دائرہ پاکستان کے دیہاتی، قبائلی، سرحدی اور کم

تعلیم یافتہ علاقوں تک محدود تھا، جب کہ آج کل عزت و ناموس کے نام پر قتل کا سلسلہ ان علاقوں تک بھی پھیلتا نظر آتا ہے جہاں پہلے ایسی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔[۳]

پاکستان کے وہ علاقے جہاں اس رسم کا نفاذ ہے، وہاں ناجائز تعلقات سے درج ذیل صورتیں مراد لی جاتی ہیں:

۱۔ غیر محرم مرد و عورت کا آپس میں تنہائی میں یا چھپ کر بیٹھنا۔

۲۔ عورت کی طرف سے پسند کی شادی کا اظہار کرنا۔

۳۔ غیر محرم مرد و عورت کا آپس میں ناجائز تعلق پیدا کر لینا۔

۴۔ کسی قریبی رشتہ دار کی طرف سے عورت پر بدکاری کا الزام لگانا۔

بعض اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن کی بنا پر کسی عورت اور مرد کو کاروکاری قرار دے کر سزا کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن زیادہ تر واقعات میں درج بالا امور ہی سزا کا سبب بنتے ہیں۔

کاروکاری کی رسم کے تحت ہونے والے بعض واقعات

رسم کاروکاری کسی نہ کسی شکل میں پاکستان کے بیش تر علاقوں، بڑے بڑے خاندانوں اور قبیلوں میں موجود ہے، جہاں ہر سال سینکڑوں افراد اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ واقعات بالعموم جنوبی پنجاب اور بلوچستان و سندھ کے قبائلی اور دیہاتی علاقوں میں زیادہ ہوتے ہیں۔ آج کل کاروکاری کے سلسلے کا مشہور واقعہ 'بابا کوٹ کیس'، جس میں پسند کی شادی کرنے والی پانچ خواتین کو تشدد کے بعد زندہ دفن کر دیا گیا، بین الاقوامی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ غیرت کے نام پر قتل کا یہ واقعہ پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے ضلع نصیر آباد کی تحصیل تمبو میں پیش آیا تھا۔

مزید وضاحت کے لیے ذیل میں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں، تاکہ اس رسم کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱- گھوٹکی کے تھانہ یارلوند کی حدود میں گاؤں لعل پتافی میں پہلوان پتافی کو شبہ تھا کہ اس کی بیوی ۲۵ سالہ حوراں کے ممتاز پتافی سے تعلقات ہیں، چنانچہ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کو اس

نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر اس کا گلا دبا دیا اور ممتاز کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔۴

۲- شکار پور کے گاؤں شہراں پور کے نزدیک ایک شخص میر محمد نے اپنی بہن مسماۃ (ن) کو ایک شخص علی نواز کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر بندوق سے فائر کر کے ہلاک کر دیا، جب کہ علی نواز نے بھاگ کر اپنی جان بچالی۔ اس قتل کا مقدمہ درج نہیں ہوا اور مقتولہ کو بغیر کفن کے دفن کر دیا گیا۔۵

۳- ۱۳ دسمبر ۲۰۰۳ء کو امان کوٹ کے قریبی گاؤں رحیم آباد (سوات) میں عمر علی نامی شخص نے اپنی ماں ۴۰ سالہ مسماۃ زینت کو قتل کر دیا۔ ملزم نے کہا کہ اسے اپنی ماں کے کردار پر شک تھا۔۶

۴- ۴۰ سالہ شمائلہ کی شادی ۲۲ سال قبل حسن سے ہوئی تھی۔ شمائلہ مقامی ہیلتھ سنٹر میں لیڈی ہیلتھ وزیٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔ شمائلہ کی بیٹی ریشم نے اپنی مرضی سے شادی کر لی جس کی شمائلہ نے حمایت کی۔ حسن اور اس کے بھائی نے ریشم کے خاوند پر ریشم کو اغوا کرنے کا مقدمہ درج کروا دیا، لیکن شمائلہ نے عدالت میں اپنے خاوند کے دعوے کے خلاف اور ریشم کی شادی کے حق میں گواہی دی۔ عدالت سے واپسی پر حسن نے شمائلہ کو قتل کر دیا اور الزام لگایا کہ اسے کسی اور مرد کے ساتھ دیکھا گیا تھا، وہ کاری ہے۔ چنانچہ اسے کاروکاری کے مقامی رواج کے مطابق زمین میں اتار دیا گیا، یعنی اس کی میت کو غسل دیا گیا نہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی، بس ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔۷

۵- رحیم یار خان موضع اکرم آباد کے رہنے والے نبی بخش نے کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے اپنے چھوٹے بھائی عارف کو قتل کر دیا۔ نبی بخش کو شبہ تھا کہ اس نے اس کی بیوی سے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ پولیس تھانہ کوٹ سمابہ نے مقدمہ درج کر کے ملزم نبی بخش کو گرفتار کر لیا۔۸

۶- ۱۶ فروری ۲۰۰۵ء موضع ڈھانڈلہ تحصیل جام پور ضلع راجن پور کے فاضل خان ولد عبدالحکیم نے تھانہ داجل میں اپنے بیٹے غلام سرور کے خلاف ایف۔آئی۔آر درج کرائی کہ اس نے اپنی بہن مسماۃ جیون مائی کو قتل کر دیا ہے۔ وجہ عناد یہ تھی کہ اس کو شک تھا

کہ اس کی بہن کے چھتہ ولد غفور قوم جھانگڑ سکنہ چٹول سے ناجائز تعلقات ہیں۔۹

۷- ۱۳/اکتوبر ۲۰۰۳ء آٹھ بجے صبح پکا میانوالی تحصیل روجھان ضلع راجن پور میں رحیم حسین نے اپنے پڑوسی ریاض احمد اور اپنی بھابی مسماۃ زرینہ زوجہ کریم حسین کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ ملزم کو شک تھا کہ دونوں کے آپس میں ناجائز تعلقات ہیں۔۱۰

رسم کاروکاری اور اسلامی تعلیمات

رسم کاروکاری میں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، بدکاری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اگر ملزمین کو کسی وجہ سے قتل نہ کیا جاسکے تو انہیں زبردست قسم کی سزائیں دی جاتیں ہیں۔ بدکاری کے شبہ میں جو سلوک اس رسم میں کیا جاتا ہے، اسلامی احکام اس سے متصادم ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی نظر میں زنا ایک انتہائی قبیح اور گھناؤنا فعل ہے اور اس کی سزا بھی انتہائی سخت ہے، لیکن اسے ثابت کرنے کے لئے بھی پورا نظام ہے۔ اس نظام کے تمام مراحل کے پایۂ تکمیل ہونے تک ملزم کو مجرم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ذیل میں اس نظام کے بارے میں مختصراً تحریر کیا جاتا ہے، تاکہ کاروکاری اور اس جیسی دوسری رسوم کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر واضح ہو سکے۔

زنا کے بارے میں اسلامی احکام

زنا کی تعریف امام ابوحنیفہؒ یہ کرتے ہیں:

''ایسی زندہ عورت کے ساتھ رحم کی جانب سے مجامعت کرنا جو ملک ونکاح میں نہ ہو اور نہ اس کے ملک ونکاح میں ہونے کا شبہ ہو اور عورت زانیہ اُس وقت شمار ہوگی جب کہ وہ اس حالت میں مرد کو اپنے ساتھ اس فعل کا ارتکاب کرنے دے۔''۱۱

علامہ شوکانی نے زنا کی یہ تعریف کی ہے:

الزناهو وطأ الرجل للمرأة فی فرجها من غير نكاح ولا شبهة نكاح. ۱۲	زنا یہ ہے کہ آدمی کسی عورت کے ساتھ بغیر نکاح واحتمال نکاح کے جماع کرے۔

مرد اور عورت بدکاری میں ملوث پائے جائیں تو ان کے بارے میں قرآن مجید

میں یہ حکم دیا گیا ہے:

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ..... (النور:٢)

بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اس سے پہلے سورۂ نساء میں ارشاد ہوا تھا:

وَالّٰتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلاً. وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِن تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّاباً رَّحِيماً۔(النساء:١٥-١٦)

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انھیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں آیات مبارکہ کی تطبیق حضرت عبداللہ بن عباس کے اس قول سے ہو جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''ابتدا میں عورت زنا کرتی تھی تو وہ گھروں میں قید کر دی جاتی تھی، اگر مرگئی تو مرگئی اور اگر زندہ رہی تو زندہ رہی، یہاں تک کہ سورۂ نور کی یہ آیت نازل ہوئی -(الزانیة والزانی) اس طرح اللہ نے ان کے لیے ایک راہ پیدا کر دی، اب اگر کوئی اس طرح کی حرکت کرتا تو کوڑے لگا کر چھوڑ دیا جاتا۔[١٣]

جرم زنا کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کی دو قسمیں ہیں :١-زانی محصن، ٢-زانی غیر محصن۔ محصن وہ شخص ہے جو بحالتِ نکاح اپنی بیوی سے مباشرت کر چکا ہو۔ جمہور کے نزدیک زانی محصن کی سزا پتھروں سے مار کر قتل کر دینا ہے، یا وہ سزا جو اس کے قائم مقام ہو۔[١٤] غیر محصن وہ شخص ہوتا ہے جو بحالت نکاح اپنی بیوی سے مباشرت نہ کر چکا ہو۔ اس کے بارے میں اتفاق ہے کہ ایسے زانی کو سو کوڑے مارے جائیں گے۔[١٥]

حد زنا میں مرد وعورت دونوں برابر ہیں، یعنی اگر دونوں محصن ہیں تو انھیں سنگ سار کیا جائے گا اور اگر وہ غیر محصن ہیں تو دونوں کو کوڑے لگائے جائیں گے۔ اور اگر ان میں ایک محصن ہے تو اُسے سنگ سار کیا جائے گا، اور دوسرے کو کوڑے لگائے جائیں گے۔[۱۶]

زنا ثابت کیسے کیا جائے؟ اس کے لیے اسلام کا قانون شہادت موجود ہے۔ شہادت لغت میں خبر قاطع کو کہتے ہیں۔[۱۷] فقہ میں شہادت کی تعریف یہ کی گئی ہے:

اخبار عن مشاهدة وعيان لا عن تخمين و حسبا ن.[۱۸]	شہادت کسی واقعے کے بارے میں اپنے مشاہدے اور دید کے مطابق خبر دینے کو کہتے ہیں، نہ کہ ظن وتخمین کی بنیاد پر۔

علامہ عینی نے اس کی یہ تعریف کی ہے:

''شہادت اس قطعی اور فیصلہ کن بیان کا نام ہے جو قانونی عدالت میں حاضر ہو کر کسی ایسے معاملے کے متعلق دیا جاتا ہے جو بیان کرنے والے شاہد نے صاف طور پر دیکھا ہے۔[۱۹]

شہادتِ زنا کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

وَالّٰتِیْ یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُواْ عَلَيْهِنَّ أَرْبَعةً مِّنكُمْ. (النساء:۱۵)	تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں اُن پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ بدکاری کے معاملے میں ضروری ہے کہ عینی شاہدوں کی تعداد چار ہو۔ اگر چار سے کم گواہ شہادت دیں تو شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور گواہوں پر حد قذف جاری ہوگی۔ اور گواہ بھی مرد ہوں، اس لیے کہ زنا کے مقدمات میں جمہور کے نزدیک عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔[۲۰] البتہ علامہ ابن حزم کے نزدیک تین مرد اور دو عورتوں کی یا دو مرد اور چار عورتوں کی یا ایک مرد اور چھ عورتوں کی، حتی کہ آٹھ عورتوں کی شہادت بھی قبول کی جائے گی۔[۲۱] اگر چار گواہوں میں سے تین زنا کی بالصراحت شہادت دیں اور چوتھا مشتبہ بات کہے تو تینوں گواہوں پر حد قذف لگائی جائے

گی۔مثلاً اگر تین گواہوں نے زنا کی مشروعہ شہادت دی،لیکن چوتھے نے کہا کہ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ ملزم اور ملزمہ ایک بستر پر ایک لحاف میں لیٹے ہوئے تھے تو ملزموں پر حد نہیں جاری ہوگی اور تین گواہوں پر حد قذف جاری ہوگی۔

زنا کے گواہوں میں اُن تمام خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے جو عام گواہوں میں از روئے شرع ہونا ضروری ہیں،ان کے علاوہ بھی چند شرائط اور خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔مثلاً گواہوں نے اصالتاً واقعۂ زنا کا اس کی تمام شرعی تفصیلات کے ساتھ مشاہدہ کیا ہو۔اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شہادۃ علی الشھادۃ اور سماعی شہادت قابلِ قبول نہیں۔۲۲ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ضروری ہے کہ چار گواہ ایک ہی مجلس میں حاکم مجاز کے سامنے حاضر ہوکر گواہی دیں۔۲۳ اسی طرح شہادت میں تمام گواہوں کے بیان یکساں ہوں،اگر ان کے بیانات میں اختلاف ہو تو قاضی ان کو رد کرسکتا ہے۔۲۴

ہر طرح کے مقدمات میں قاضی کو چاہیے کہ وہ گواہوں کا تزکیہ کرے،خاص طور پر حدود کے مقدمات میں،جب گواہ شہادت دے چکیں تب ان کا تزکیہ کرایا جائے گا۔روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ شہادت کے بعد گواہوں کا تزکیہ کرایا تھا۔۲۵

جب چار افراد زنا کی شہادت قاضی کے روبرو دیں تو قاضی کو چاہیے کہ ان سے یہ پوچھے کہ زنا کیا ہے؟ کس طرح ہوا؟ کب کیا گیا اور کہاں کیا گیا؟ ماہیت زنا کا سوال اس لیے ضروری ہے کہ بعض لوگ ہر قسم کی حرام صحبت کو زنا سمجھتے ہیں۔صحبت کرنے کے علاوہ دیگر چیزوں کو بھی شرع میں زنا کہا گیا ہے مثلاً العینان تزنیان (آنکھیں زنا کرتی ہیں) والیدان تزنیان (اور ہاتھ زنا کرتے ہیں) والرِجلان تزنیان (اور پیر زنا کرتے ہیں) لیکن اس کے بعد ارشاد ہے والفرج یصدّق ذٰلک اویکذّب (اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے) حد صرف شرم گاہ میں جماع کے سبب واجب ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح حضرت ماعزؓ سے استفسار کیا تھا،یہاں تک کہ ان سے یہ بھی سوال کیا تھا کہ کیا تم نے اس طرح صحبت کی تھی جیسے سرمہ دانی میں سلائی،اور کنویں میں

رسی ڈالتے ہیں، ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے تم نے اس کا بوسہ لیا ہو، ممکن ہے تم نے اس کو چھوا ہو۔۲۶

قرائن قاطعہ

اسلام کے قانون شہادت میں قرائن قاطعہ یا شہادت حالی (Circumstancial Evidence) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔فقہاء اس کی تعریف یوں کرتے ہیں ''ایسی نشانی یا علامت جو حدِّ یقین تک پہنچنے والی ہو۔۲۷ ڈاکٹر سید ازکیا ہاشمی کے مطابق ''یہ ایسی ناقابلِ تردید شہادت ہوتی ہے جو حالات و واقعات سے اس طرح مستنبط ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی اور نتیجہ نکالنا مشکل ہوتا ہے'' ۲۸قرآن کریم سے بھی قرائنی شہادت کا ثبوت ملتا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے کردار کی برأت کے لیے کوئی ظاہری شہادت موجود نہ تھی تو قرائنی شہادت ہی کی تجویز پیش کی گئی۔(یوسف:۲۶-۲۹)

آں حضرت ﷺ کے دور میں بھی بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قرائن کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا۔مثال کے طور پر غزوۂ بدر میں حضرت معوذؓ اور حضرت معاذؓ دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک ابوجہل کو قتل کرنے کا مدعی تھا، آں حضرت نے ان کے درمیان قرائن کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا۔ان سے آپؐ نے سوال کیا کہ کیا اُنھوں نے تلواریں تو صاف نہیں کیں؟ اُنھوں نے عرض کیا: نہیں۔آپؐ نے فرمایا: اُنھیں لے آؤ۔تلواریں دیکھ کر آپ نے ایک کے متعلق ارشاد فرمایا: اس تلوار نے اسے قتل کیا ہے۔چنانچہ ابوجہل کا سامان اُس تلوار کے مالک کو دے دیا۔۲۹

ڈاکٹر ہاشمی کے مطابق ''جدید سائنسی ترقی کے نتیجے میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کسی عورت کے متعلق یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ اس نے زنا کیا ہے یا نہیں؟ مرد و عورت کی منی کے ذریعے، جو کپڑوں کے ساتھ لگی ہو، تجزیہ کر کے بتایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے بدکاری کی ہے۔ڈیڈیو کیمروں کے ذریعے ان کے بلیو پرنٹ نکالے گئے ہوں تو یہ بھی جرم زنا کے اثبات کے لیے ایک قرینہ ہے۔مگر اسے قطعی قرینہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس میں بھی دھوکے کا احتمال ہے، البتہ دیگر شواہد کے ساتھ اس قرینہ سے شہادت کو تقویت مل سکتی ہے۔۳۰

اب اگر مدعی درج بالا معیار کے مطابق اپنا الزام ثابت نہ کر سکے تو یہ نہیں ہے کہ اب معاملہ ختم ہو گیا، بلکہ اس کی طرف سے لگایا جانے والا الزام اب تہمت بن چکا ہے۔ اس نے ایک عزت دار کی عزت سر بازار اچھالی ہے۔ اسلام اس کے لیے بھی سزا کا پورا ایک نظام رکھتا ہے جسے قانون قذف کہا جاتا ہے۔

کاروکاری میں قتل کی روایت اور اسلامی احکام

بدکاری ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کی سزا بھی یقیناً بہت سخت ہونی چاہئے۔ اسلام اس کے لیے پورا ایک نظام رکھتا ہے۔ جس کے مطابق سزا کے احکام صادر کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس معاملے کو اپنی جھوٹی انا، ذاتی و معاشی مفاد، علاقائی و سیاسی اختلاف اور غیر قانونی و غیر اخلاقی رسوم کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اسلام اس کی کلیۃً اجازت نہیں دیتا کہ صرف شبہات اور افواہوں کی بنیاد پر کسی کی زندگی لے لی جائے۔ اور بالفرض اگر معاملہ سچا بھی ہو تو اسلام کسی کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ جو کوئی یہ حرکت کرتا ہے اسلام اسے زمین میں فساد پھیلانے والا قرار دیتا ہے اور اسے خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيْماً.
(النساء:۹۳)

اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوئی اور اس کے لیے اس نے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

علاوہ ازیں وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ فرما کر واضح کر دیا کہ بلا جواز، بلا انصاف اور بے وجہ کسی کا قتل حرام ہے۔ مولانا مودودی 'اِلَّا بِالْحَقِّ' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یعنی انسانی جان، جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھہرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ، اب رہا یہ سوال کہ ''حق کے ساتھ'' کا کیا مفہوم ہے تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور دو صورتیں اس پر زائد نبیؐ نے بیان فرمائی

ہیں۔قرآن کی بیان کردہ صورتیں یہ ہیں:

۱۔ انسان کسی دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق قائم ہوگیا ہو۔

۲۔ دین حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔

۳۔ دار الاسلام کے حدود میں بدامنی پھیلائے، یا اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرے۔

باقی دو صورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں، یہ ہیں:

۴۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

۵۔ ارتداد اور خروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

ان پانچ صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے۔خواہ وہ مومن ہو یا ذمی یا عام کافر۔[۳۱]

احادیث مبارکہ میں بھی ناجائز طریقے سے قتل کی ممانعت آئی ہے اور غیرت میں آکر قانون ہاتھ میں لینے کو غلط قرار دیا گیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل رجل مسلم[۳۲]	بے شک ساری دنیا کا مٹ جانا کم تر ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلم کے قتل سے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ انصاریؓ نے کہا: یارسول اللہ، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پائے، کیا اُس کو مار ڈالے؟ رسول اللہ نے فرمایا: نہیں۔[۳۳]

کاروکاری میں میت کے حقوق پورے نہ کرنا

بعض قبائل میں یہ طریقہ رائج ہے کہ کاروکاری کے تحت قتل ہونے والے مرد وعورت کی لاش دریا میں بہادی جاتی ہے۔کچھ لوگ قتل ہونے والوں کو غسل دیتے ہیں نہ کفن۔ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے بغیر ہی قبر میں دفنا دیا جاتا ہے۔بعض قبائل تو قبر تک نہیں بناتے، بلکہ صرف ایک گڑھا کھود کر میّت کو

اُس میں دفنا دیتے ہیں۔ یہ سلوک اکثر وبیش تر وہ لوگ کرتے ہیں جو کاروکاری کے واقعات کا افشا نہیں چاہتے، بلکہ غیرت کے نام پر قتل کر کے واقعے اور لاشوں کو چھپاتے ہیں، تا کہ عوام اور حکومت/ انتظامیہ کو خبر نہ ہو۔ تھانہ سیمنٹ فیکٹری، بارڈر ملٹری پولیس کے انچارج غلام حسن خان کھوسہ کے مطابق پہاڑوں میں اکثر وبیش تر لاوارث لاشیں ملتی رہتی ہیں جن کے بارے میں غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ لوگ ناجائز تعلقات کی بنا پر قتل کر دیے جاتے اور دور کسی پہاڑ وغیرہ پر پھینک دئے جاتے ہیں۔[۳۴]

اسلام، میت کے حقوق ادا کرنے پر زور دیتا ہے، خواہ مقتول یا مقتولہ بدکاری کے تحت سزا یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک خاتون نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ اس وقت زنا کی وجہ سے حاملہ تھی۔ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی، میں نے ایسا فعل کیا ہے کہ مجھ پر حد واجب ہوگئی ہے، لہٰذا آپ مجھ پر حد قائم فرمائیں۔ نبیؐ نے اس کے سرپرست کو بُلایا اور فرمایا: اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، جب وضع حمل سے فارغ ہو تب میرے پاس لانا۔ اس نے ایسا ہی کیا تب نبیؐ نے حکم دیا کہ اس کے کپڑے مضبوطی سے باندھ دئے جائیں، پھر حکم دیا گیا کہ اسے سنگ سار کر دیا جائے، چنانچہ اسے رجم کر دیا گیا۔ پھر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تو حضرت عمرؓ بولے: اے اللہ کے نبیؐ، آپ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے جو زنا کر چکی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کو مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائے تو ان سب کے لیے کافی ہو جائے''۔[۳۵]

اس حدیث کی تشریح میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''رجم کی سزا میں جب مجرم مر جائے تو پھر اس سے پوری طرح مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کی تجہیز وتکفین کی جائے گی، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور کسی کے لیے جائز نہ ہوگا کہ اس کا ذکر بُرائی کے ساتھ کرے۔[۳۶]

اسی طرح حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ اسلم نامی قبیلہ کا ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور زنا کا اعتراف کیا۔ نبی ﷺ نے اپنا منہ پھیر لیا حتیٰ کہ

اُس نے اپنے خلاف چار مرتبہ گواہی دی، تب آپ نے اس سے دریافت فرمایا: تجھے جنون تو لاحق نہیں؟ وہ بولا: نہیں، تب آپؐ نے حکم صادر فرمادیا، اور اسے عیدگاہ میں رجم کردیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد نبی کریمؐ نے اُسے خیر سے یاد فرمایا اور اُس کی نماز جنازہ خود پڑھائی۔[۳۷]

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ناجائز تعلقات میں ملوث مرد وعورت سزا پانے کے بعد طعن وتشنیع کا نشانہ نہیں بنائے جاسکتے۔ اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسا کہ عام مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ بدکاری کے مجرم جن پر جرم ثابت بھی ہوجائے اور وہ اقرار بھی کرلیں اور سزایافتہ بھی ہوجائیں، اُن سے تو شریعت اسلامی اچھا سلوک کرنے کا حکم دے اور شارع اسلام ادب واحترام کا عملی نمونہ پیش فرمائیں تو ہمارے ہاں محض ناجائز تعلقات کے شبہ پر ہی انسانی جان کو ہلاک کردینا، اُن کی آخری رسومات کو پورا نہ کرنا اور ساری زندگی اُن کی اولاد اور اعزہ کو کالا کالی کا طعنہ دیتے رہنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟!

ہتک آمیز سلوک کرنا

رسم کاروکاری میں اگر مرد وعورت قتل ہونے سے بچ جائیں تو اُنہیں مختلف جسمانی، معاشرتی اور نفسیاتی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ مرد کو ساری زندگی سرداروں کی نوکری کرنی پڑتی ہے اور وہ معاشرے کی نظر میں گرا رہتا ہے، جب کہ عورت بھی سرداروں اور پیروں کی لونڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں بھیڑ بکریوں کی طرح اُن کی خرید وفروخت بھی ہوتی ہے۔ اسلام اس طرح کے تشدّد اور جبر کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ محض شک وشبہ کی وجہ سے کسی انسان پر بدکاری کے الزام لگانے والے کو قذف کی سزا دیتا ہے اور کسی پر بدکاری ثابت ہوجانے پر بھی اُس کے ساتھ نہایت ادب واحترام کا رویہ اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔

اگر کسی شخص پر بدکاری کا الزام عائد ہوجائے تو اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی تیسرا شخص، خواہ وہ قاضی ہو یا حاکم، ملزمان کو اپنے قبضے میں

رکھے، اُسے غلام اور لونڈی سمجھ کر اُس سے غیر انسانی اور غیر اخلاقی سلوک کرے، وہ یا اُس کے حواری ملزمان کو اپنی عیش وعشرت کا سامان بنائیں۔

تہمتِ زنا کے بعد شوہر، والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو کیا سلوک کرنا چاہیے اُس کے احکام واقعۂ افک (النور:۱۱-۱۲) سے تفصیلی طور پر معلوم کیے جاسکتے ہیں۔

ثبوت ضروری ہے

رسم کاروکاری میں کسی کی بھی زبان سے مرد وعورت کے ناجائز تعلقات کا اظہار ہوجائے تو اُنھیں مُجرم ٹھہرادیا جاتا ہے۔کوئی ثبوت، اقرار یا چشم دید شہادت لازمی نہیں ہوتی۔ پروفیسر محمد اشرف شاہین قیصرانی کے بقول ''سیاہ کاری (ناجائز تعلقات) کی سزا مرد وعورت دونوں کا فوری قتل ہے، اس ضمن میں کسی گواہ یا ثبوت کی ضرورت کم ہی محسوس کی جاتی ہے''۔۳۸ جب کہ اسلامی حکومت کسی بھی شخص کے خلاف ناجائز تعلقات/بدکاری کے جرم میں کوئی کاروائی نہیں کرسکتی، جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت نہ مل جائے۔ مدینہ میں ایک عورت تھی جس کی چال ڈھال سے لگتا تھا کہ وہ کھلی ہوئی فاحشہ ہے، لیکن اس کے خلاف بدکاری کا ثبوت نہ تھا، اس لیے اسے کوئی سزا نہ دی گئی، حالاں کہ اس کے متعلق نبیؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ تک نکل گئے تھے:

لو کنت راجماً احداً بغیر بینة لرجمتها ۔۳۹	اگر میں ثبوت کے بغیر رجم کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو ضرور رجم کرادیتا۔

عہد نبویﷺ میں خود آں حضرتﷺ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ جو 'افک' کے نام سے تاریخ کا حصہ ہے، رسم کاروکاری کے ناجائز ہونے اور بدکاری/ناجائز تعلقات کے الزام کی صورت میں طریق کار طے کرنے کے لئے بہترین مثال ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ پر الزام لگا تو نہ شوہر نے، نہ باپ اور بھائی نے اور نہ کسی رشتہ دار نے حضرت عائشہؓ کو کسی قسم کی جسمانی تکلیف دی اور نہ واقعہ کے نتیجے میں کوئی قتل وغارت ہوئی، بلکہ فیصلہ اللہ کی شہادت پر ہوا اور وہ بے گناہ ٹھہریں۔اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے ساتھ اُم جمیل متّہم ہوئیں تو ان کے کسی گھر والے کی طرف سے

کوئی انتہائی قدم نہیں اُٹھایا گیا، بلکہ معاملہ حضرت عمر فاروقؓ کی عدالت میں زیر بحث لایا گیا اور تحقیق کے بعد حضرت مغیرہؓ اور اُم جمیل بے گناہ ٹھہرے۔[۴۰]

تجاویز اور سفارشات

ہر علاقے اور قوم کی اپنی روایات ہوتی ہیں جو اچھی ہوں یا بری ان کا تسلسل انہیں تحفظ فراہم کرتا ہے۔ روایات سے انحراف جرم گردانا جاتا ہے۔ جہالت کے دور کی روایات تو اتنی راسخ اور مروج ہوتی ہیں کہ ان سے روگردانی گناہ کے زمرے میں آجاتی ہے۔ یہی حال پاکستان کے مختلف قبائل اور پہاڑی و دیہاتی علاقوں میں رائج رسم کاروکاری کا ہے۔ گذشتہ چند برسوں سے پاکستانی معاشرے کو جن امور کی وجہ سے مطعون ٹھہرایا جارہا ہے ان میں کاروکاری وکالا کالی یا سیاہ کاری بھی شامل ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم اور قابل ذکر تجاویز اور سفارشات پیش کی جائیں، تاکہ اس رسم کے استیصال کے لیے مناسب طریقہ کار سامنے آسکے:

۱- اسلامی تعلیمات پر عمل

اگر تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ اسلامی تعلیمات پر استوار کیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ کاروکاری جیسی جاہلی رسومات کا خاتمہ نہ ہوسکے۔ بقول سید قطب شہید: ''اسلام کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ جاہلی تصورات کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرے۔ یہ موقف اسلام نے اس روز بھی اختیار نہ کیا جس روز اس نے دنیا میں قدم رکھا اور نہ آئندہ اس کی امید ہوسکتی ہے، کیوں کہ جاہلیت خواہ کسی دور کی بھی ہو جاہلیت ہے۔[۴۱] ہمیں اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے معاشرے میں بہت حد تک غیر اسلامی روایات اور رواجوں کی پاس داری کی جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے، کیوں کہ جہالت اور کم علمی ہی کی وجہ سے معاشرے کے تمام قبیح رسوم و رواج جنم لیتے ہیں، اس لئے معاشرے کے ہر فرد کو تعلیم یافتہ بنانا دراصل ان رسوم اور رواجوں کے خاتمے کی پہلی سیڑھی ہے۔

۲-مساواتِ مرد وزن

کاروکاری جیسی رسم کے خاتمے کے لئے ایک خاص اور اہم ضرورت مساوات مرد وزن کا تصور عام کرنا ہے۔ جب تک عورت اور مرد کو ہمارے معاشرے میں مساوی درجہ نہیں دیا جاتا اس وقت تک اس سطح کی رسوم کا سامنا رہے گا۔ اگر چہ آئین پاکستان (۱۹۷۳ء) کے آرٹیکل ۲۵ میں واضح طور پر درج ہے کہ تمام شہری بلا امتیاز صنف قانون کی نظر میں برابر ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے لیے ضروری اقدامات نہیں کیے گئے۔ خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک کے خاتمہ کے لئے منفی سماجی رویوں اور امتیازی قوانین میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

۳-قانون سازی اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنانا

رسم ورواج چونکہ انسان اپنے ماحول اور طبیعت کے زیر اثر اختیار کرتا ہے اور پھر پسندیدگی کی بنا پر اس پر عمل کرنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب تک ان رسوم اور رواجوں کا مذہب یا ملکی قانون سے براہ راست تصادم نہ ہو، کوئی بھی حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی، لیکن اگر یہی رسم ورواج انسانوں کی خیر وخواہی اور بہتری کے بجائے بوجھ، دکھ اور مصیبت کا باعث بن جائے اور ان کا ٹکراؤ مذہب اور ملکی قانون سے ہونے لگے تو پھر ان کی اصلاح کے لیے مداخلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں قانون سازی کرنا حکومت کا اولین فرض بن جاتا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسی رسوم کے خلاف نہ صرف قانون سازی کرے، بلکہ ان پر عمل درآمد کو بھی یقینی بنائے، تاکہ ملک میں امن وامان برقرار رہے۔ کاروکاری جیسی دوسری رسوم پر مقامی حکومت سے لے کر وفاقی حکومت تک ضلعی اسمبلی، صوبائی اسمبلی، قومی اسمبلی، سینٹ، سیکورٹی کونسل اور کابینہ میں بحث کی جائے اور اس بحث کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری قانون سازی کی جائے اور پہلے سے موجود قوانین پر متعلقہ اداروں کے ذریعے عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔ پورے ملک میں عمومی طور پر اور متاثرہ علاقوں میں خصوصی طور پر ان قوانین پر عمل درآمد کرانے اور جواب دہی کے عمل کو متعارف کرانے کے لئے حکومتی وغیر حکومتی سطح پر ایسی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جن میں صحافی، تنظیمی ادارے، پولیس، ناظمین اور کونسلرز اور لیڈی کونسلرز کو شامل

کیا جائے، جو متعلقہ رسوم و روایات کے بارے میں عوامی سطح پر شعور اُجاگر کریں اور اس میدان میں کام کرنے والے افراد کی مدد کریں۔ بقول محمد اسلم صدیق: ''غیرت کے نتیجے میں ہونے والے قتل کی بڑی وجہ اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہونا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی آبرو کا جنازہ نکلتے دیکھے اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اس کی عزت کو پامال کرنے والے کو سزا نہیں ملے گی تو وہ اپنی آبرو کے نقصان کی تلافی یہی سمجھتا ہے کہ اس جرم کے ذمہ دار کو خود ہی قتل کر دے، اس لیے ضروری ہے کہ حکومت اسلامی سزاؤں کا نفاذ کرے''۔۴۲

۴-لازمی اور معیاری تعلیم

قبائلی اور پہاڑی علاقوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے، جب کہ دیہاتی علاقوں میں بھی شرح خواندگی بہت مایوس کن ہے، خاص طور پر، بقول پروفیسر ثریا بتول: ''ہماری عورت کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ ناخواندہ اور جاہل ہے۔ دیہاتوں کی محنت کش خواتین جو اپنے مردوں کے تشدد کا شکار بنتی ہیں وہ بھی ہیں جن کے شوہر منشیات کے عادی ہیں اور وہ دوسروں کے گھروں میں کام کر کے برتن دھو کر صفائی کر کے اپنے بال بچوں اور شوہروں کو پال رہی ہیں، یہ سب جہالت کے نقصانات ہیں''۔۴۳ ڈسٹرکٹ پبلک سیفٹی کمیشن سکھر کے چیئرمین سید شفقت حسین شاہ کے مطابق: ''کاروکاری کا مسئلہ کم تعلیم یافتہ اور پس ماندہ علاقوں میں زیادہ رائج ہے اور اس کا شکار دیہات میں رہنے والے وہ مرد اور عورتیں ہیں جو ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ ایسی رسوم کا خاتمہ فقط تعلیم سے ہی ممکن ہے''۔۴۴

چنانچہ مذکورہ بالا عورتوں میں تعلیم کا شعور بیدار کیا جائے اور نوعمر اور بڑی عمر کے لوگوں کے لئے بغیر کسی مالی اور رواجی رکاوٹ کے لازمی اور معیاری تعلیم کا بندوبست کیا جائے، کیونکہ تعلیم نہ ہونے کے باعث لوگ اپنے حقوق سے لاعلم ہیں۔ انھیں انسانیت کی تعلیم دی جائے۔ تعلیمی نصاب میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ اس سے منفی امتیازی رویوں کا خاتمہ ہو اور صنفی مساوات کو فروغ ملے۔ پروفیسر ثریا بتول کے مطابق ''عورت کو اگر دین و دنیا کی کما حقہ تعلیم دی جائے تو وہ یقیناً نہ خود مظالم کی شکار بنے نہ کسی پر ظلم ڈھائے۔ یقینی امر ہے کہ تعلیم ہی ایک ہتھیار ہے جو انسان میں خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جرأت مند بنا دیتا ہے۔ دوسری

طرف اپنے فرائض کا شعور دے کر دوسروں کی حق تلفی کرنے سے بھی روکتا ہے''۔۴۵ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جو بیک وقت دینی اور عصری تعلیم فراہم کرسکیں۔

۵-غربت کا خاتمہ

رسم کاروکاری کے خاتمہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ غربت اور معاشی مسائل کا خاتمہ کیا جائے۔حکومت کی ہر سطح پر پہلی ترجیح ہونی چاہیئے کہ غربت کو کم کرنے کے لیے لوگوں کی بالخصوص عورتوں کی آمدنی میں اضافے کے لیے موثر طریقۂ کار وضع کرے۔کیونکہ تحقیق کے دوران میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ بہت سے خاندان غربت کی بنا پر اپنی عورتوں کو کاروکاری قرار دے دیتے ہیں، تاکہ انہیں فروخت کیا جاسکے۔ چنانچہ لوگوں کی معاشی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے ان کو آسان شرائط پر کاروباری قرضہ جات فراہم کیے جائیں، ووکیشنل ٹریننگ کے ذریعے انہیں مختلف قسم کے ہنر سکھائے جائیں، انسانی حقوق سندھ کے رہ نما محمد چھٹل چاچڑا کہتے ہیں کہ ''کاروکاری کی بہت سی وجوہ ہیں، لیکن سب سے بڑی وجہ معاشی مسئلہ ہے۔خاص طور پر دیہی علاقوں میں نوجوان دن بھر ہوٹلوں میں بیٹھ کر اور جوا کھیل کر وقت ضائع کرتے اور چوری ڈاکے ڈالتے ہیں۔یہی لوگ اپنی معصوم اور محنتی خواتین (جو کھیتوں میں جا کر دن بھر کام کرتی ہیں) کو کسی کے ساتھ بات کرنے یا ذاتی رنجش کی خاطر کاری کا الزام لگا کر قتل کردیتے ہیں''۔۴۶

۶-فوری اور سستے انصاف کی فراہمی

عدل دنیا کے ہر مذہب اور ہر معاشرے میں اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔جس معاشرے میں عدل نہ ہو وہ فتنہ وفساد، انتشار و بدامنی، ظلم وعدوان کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ فوری اور سستے انصاف کی دست یابی کسی بھی انسانی معاشرہ کے انتظام وانصرام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مہنگا، مشکل اور پے چیدہ عدالتی نظام اور اوپر سے عوام کی اس تک عدم رسائی نے کاروکاری اور اس جیسی دوسری رسوم کو پنپنے میں بہت مدد دی ہے۔عام لوگوں کا اور خاص طور پر خواتین کا اپنے مظالم کے سلسلے میں عدالت تک پہنچنا مشکل ترین مرحلہ بن چکا ہے۔

اگر وہ کسی طرح پہنچ بھی جائیں تو وہاں مقدمے دس دس سال تک لٹکے رہتے ہیں۔ مقدمہ کرنے والے بعض اوقات قبروں میں پہنچ جاتے ہیں، مگر مقدموں کے فیصلے نہیں ہوتے۔ اس لیے اکثر لوگ عمومی طور پر اور بری رسوم سے متاثر لوگ خصوصی طور پر عدالت کا سہارا لینے کے بجائے متبادل راستے کو ترجیح دیتے ہیں، جن میں جرگہ پنچائیت اور اکٹھ کی مثالیں قابل ذکر ہیں، جہاں مذکورہ مسائل اور جھگڑوں پر فوری فیصلے کر دیے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ فوری فیصلے اپنے اندر بہت سے نقائص رکھتے ہیں، لیکن لوگ پولیس کی بے رخی اور رشوت خوری، وکلاء کی بھاری فیسیں اور سست روی کے شکار عدالتی نظام پر انہیں ترجیح دیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عدل و انصاف کے حصول کا نظام آسان اور سادہ بنایا جائے، تاکہ متاثرہ لوگ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے عدالتی کاروائی میں دقت محسوس نہ کریں، سستا اور فوری انصاف مہیا کیا جائے، نیز عائلی مقدمات کی کاروائی بند کمرے میں کی جائے، تاکہ عوام میں برائی کی تشہیر نہ ہو سکے۔ اسی طرح اسلامی سزاؤں کا نفاذ کر کے بروقت فیصلے کیے جائیں۔

حواشی و مراجع

۱۔ سندھی اردو لغت، سندھی اردو ادب بورڈ، ۱۹۸۰ء، ص ۲۹۸

۲۔ Rabia Ali,The dark side of 'Honour' Shirkat Gah, Women's Resource Center, P.O.Box: 5192, Lahore, 2001, P.4

۳۔ ماہنامہ، جہد حق، پبلشر، ندیم فاضل، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، اپریل ۲۰۰۲ء، شمارہ نمبر ۴، ص ۱۴

Muddassir Rizvi"Honour Killing" Rise in Pakistan despite state & religious opposition,11,28,2000(www.wikipedia.org)

۴۔ روزنامہ جنگ ملتان، ۱۸/دسمبر ۲۰۰۳ء ۵۔ روزنامہ خبریں، ملتان، ۹/مارچ ۲۰۰۳ء

۶۔ ماہنامہ جہد حق، لاہور، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۲۱

۷۔ 'کاروکاری، قتل کرنا غیرت نہیں' کے موضوع پر منعقد سیمینار کی رپورٹ، ۲۵/نومبر ۲۰۰۱ء لاہور، شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء، ص ۱۰

۸۔ روزنامہ جنگ، ملتان، ۲۸/جنوری ۲۰۰۳ء

۹۔ ایف،آئی،آر،نمبر:8118،تھانہ داجل،تحصیل جام پور ضلع راجن پور،16-10.2005
۱۰۔ ایف،آئی،آر،نمبر:09803،تھانہ روجھان،ضلع راجن پور،13-10.2003
۱۱۔ الکاسانی،علاؤالدین ابوبکر بن مسعود،بدائع الصنائع ،کتاب الحدود،دارالکتب العلمیہ بیروت،۱۴۱۸ھ ج۹،ص۱۷۸
۱۲۔ الشوکانی،محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر،دارالفکر بیروت،۱۹۸۳ء، ج۴،ص۴
۱۳۔ سیوطی ،جلا ل الدین ،عبدالرحمٰن، الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور،منشورات مکتبہ آیت اللہ العظمی ،قم،ایران،۱۴۰۴ھ، ج۲،ص۱۲۹
۱۴۔ ابن قدامہ، ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمود، المغنی، دارالکتب العر بیہ، بیروت ، لبنان ۱۹۸۳ء، ج،۱۰ص۱۲۲
۱۵۔ السرخسی ،محمد بن احمد بن ابی سہل ابوبکر،المبسو ط، ج۹،ص،۳۶
۱۶۔ فتح القدیر،تفسیر سورۂ نور، ج۴
۱۷۔ الز بیدی،محمد مرتضی سید،تاج العروس من جواھر القاموس،دارالفکر بیروت، ج،۵،ص۴۵
۱۸۔ ابن نجیم،زین الدین بن ابراہیم بن محمد،البحر الرائق شرح کنزالدقائق،کتاب الشہادات، دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۷ء، ج۷،ص۹۳
۱۹۔ العینی ،ابومحمد محمود بن احمد،عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری،مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ،س۔ن، ج۱۳،ص۲۷۱
۲۰۔ المغنی:۱۰،۱۷۵
۲۱۔ ابن حزم،ابومحمد علی بن احمد بن سعید،المحلیٰ ،دارالفکر بیروت،س۔ن، ج۹،ص۳۹۵-۳۹۶
۲۲۔ عودہ،عبدالقادر،الشہید،التشر یع الجنائی الاسلامی، بیروت،۱۹۶۸ء، ج،۲،ص۴۱۱
۲۳۔ بدائع الصنائع ،مطبعۃ الجمالیہ،مصر،۱۳۲۸ھ، ج۷،ص،۴۶
۲۴۔ المغنی، ج۱۰،ص۱۸۳
۲۵۔ عثمانی، ظفر احمد ، اعلا ء ا لسنن ،دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۷ء،حدیث نمبر۴۹۶۶، ج۱۵،ص۱۳۶
۲۶۔ احمد حسن،ڈاکٹر،حدود و تعزیرات،ادارۂ تحقیقات اسلا می اسلا م آباد، مئی۱۹۸۲ء، ص۱۶۲-۱۶۳
۲۷۔ ابن الفرس،الفواکہ البدریہ،ص۸۳۔مجلّہ الاحکام العدلیہ،ص۳۵۳،بحوالہ ترجمان القرآن،ص۳۱
۲۸۔ ہاشمی،سید ازکیا،قرائنی شہادت کی شرعی حیثیت،سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ،

جولائی-ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۸۷

۲۹ القشیری، مسلم بن حجاج، الصحیح، کتاب الجہاد ،باب استحقاق القاتل سلب القتیل، الحدیث: ۴۵۶۹

۳۰ قرائنی شہادت کی شرعی حیثیت، حوالہ سابق، ص ۹۰

۳۱ تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۵۹۹-۶۰۰

۳۲ الترمذی، محمد بن عیسیٰ ،الجامع السنن، ابواب الدیات ، باب ما جاء فی تشدید قتل المومن، حدیث: ۱۳۹۵

۳۳ صحیح مسلم، کتاب اللعان، حدیث: ۱۴۹۸

۳۴ انٹرویو، کھوسہ، غلام حسن، دفعہ دار، مورخہ 06-03-06

۳۵ جامع ترمذی، ابواب الحدود، باب تربّص الرجم بالحبلی حتی تضع، حدیث: ۱۴۳۵

۳۶ تفہیم الاحادیث ، ادارۂ معارف اسلامی منصورہ ، لاہور، ترتیب و تخریج ، مولانا عبدالوکیل علوی، اشاعت سوم، ۲۰۰۴ء، ج ۵، ص ۳۷۵

۳۷ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الرجم بالمصلی، حدیث: ۶۸۲۰

۳۸ قیصرانی، محمد اشرف شاہین، بلوچستان: تاریخ اور مذہب، ادارۂ تدریس، کوئٹہ، نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۳۸

۳۹ ابن ماجہ، محمد بن یزید، السنن، ابواب الحدود، باب من اظہر الفاحشہ، حدیث: ۲۵۶۰

۴۰ ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، مطبعۃ الحلبی، قاہرہ، ج ۲، ص ۸۸-۸۹

۴۱ شہید ، سید قطب ، جادہ ومنزل، ترجمہ ، خلیل احمد حامدی ، الاتحاد اسلامی العالمی و بیروت، ۱۹۸۰ء، ص: ۳۶۳

۴۲ صدیق، محمد اسلم، غیرت کے قتل کی شرعی حیثیت ، ہفت روزہ ایشیا، لاہور، ۲۰/اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۹

۴۳ علوی، ثریا بتول، جدید تحریکِ نسواں اور اسلام، منشورات، لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۰۹

۴۴ سیمینار روزنامہ خبریں سنڈے میگزین ۱۴، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۱۱

۴۵ جدید تحریکِ نسواں اور اسلام، ص ۴۱۰

۴۶ سیمینار روزنامہ خبریں سنڈے میگزین ۱۴ مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۱

سیر وسوانح

تاریخ ابن خلدون کے مترجم ومحقق
حکیم احمد حسین عثمانی

ڈاکٹر محمد صہیب

الہٰ آباد ہمیشہ سے تزکیہ وتصوف کا شہر رہا ہے۔ وہاں ہر زمانے میں علماء اور علوم وفنون کے ماہرین موجود رہے ہیں اور ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے اکتسابات سے نہ جانے کتنے ایوان علم روشن کیے اور پائیدار نقوش چھوڑے۔ ان ہی بالغ نظر شخصیات میں علامہ حکیم احمد حسین عثمانی ہیں۔ ان کا میدانِ عمل اگر چہ طب تھا، لیکن دیگر علوم وفنون میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ علمی دنیا میں وہ اپنے جس کام کی وجہ سے معروف ہیں اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، وہ ہے تاریخ ابن خلدون کا اردو ترجمہ۔ اس مضمون میں پہلے ان کے مختصر حالات زندگی بیان ہوئے ہیں اور پھر تاریخ ابن خلدون کے ترجمہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

ابتدائی حالاتِ زندگی

حکیم احمد حسین کی ولادت موضع کونڈا پور، سید سراواں، الہ آباد میں ۱۸۵۹ء میں ہوئی۔ والد ماجد کا نام حکیم بدرالدین عثمانی تھا، جو مشہور اطباء میں سے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی، لیکن کچھ عرصہ بعد جب یہ گھرانہ شہر منتقل ہوگیا، تو وہاں کے مدرسہ اسلامیہ میں ان کا داخلہ ہوا، جہاں مشہور عالم دین مولانا محمد حسین صاحب سے حدیث، فقہ، منطق وفلسفہ اور ریاضی کی کتابیں پڑھیں۔ پھر مزید حصول علم کے لئے کان پور کا سفر کیا۔ وہاں مولانا احمد حسن (محشی مثنوی مولانائے روم)[۱] کے حلقۂ درس کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل تھی۔ مولوی احمد حسین عثمانی نے بھی اس حلقۂ درس میں شامل ہوکر عربی علوم کی

تکمیل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ کا سفر کیا اور طب یونانی کے ماہر استاذ حکیم حیدر حسین طبیب شاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے کم سنی کے سبب اپنے یہاں داخلہ دینے سے احتراز کیا، لیکن ایک موقع پر ان کی غیر معمولی ذہانت سے حیرت زدہ ہوکر انھیں اپنے حلقۂ درس میں شامل کرلیا۔[۲] یہاں انھوں نے طب کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد کلکتہ کا سفر کیا اور وہاں مطب قائم کیا۔ لیکن جلد ہی اپنے والد کی علالت کی وجہ سے وطن واپس آنا پڑا پھر وہیں کے ہورہے۔[۳]

طبی مہارت

الٰہ آباد میں حکیم احمد حسین نے مطب قائم کیا اور علاج معالجہ میں مصروف ہوگئے۔ وہ ایک ماہر طبیب اور نباض تھے، انھیں دست شفا عطا ہوا تھا۔ امراء، غرباء ہر طرح کے لوگوں کا مجمع ہوتا۔ ۱۸۹۹ء میں الٰہ آباد میں طاعون کی وبا پھیلی تو انھوں نے بے شمار مریضوں کا علاج بڑی دل جمعی اور دل جوئی کے ساتھ کیا، اس بنا پر مریض کثرت سے رجوع کرنے لگے اور آپ کا شمار الٰہ آباد کے ممتاز معالجین میں ہونے لگا۔[۴]

حکیم صاحب کو فن طب پر دست رس حاصل تھی۔ تشخیص امراض میں ماہر تھے۔ مرض کے دفعیہ اور علاج سے متعلق ان کے بہت سے حیرت انگیز واقعات مشہور ہیں۔[۵]

میدانِ طب میں خدمات

حکیم صاحب کی طب یونانی پر گہری نظر تھی۔ وہ اس کی باریکیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کے مجربات اور تجویز کردہ نسخے آج بھی طب یونانی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ حکیم صاحب نے خود کو مطب تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ طب یونانی کے ارتقاء اور ترویج کی فکر بھی انھیں دامن گیر رہتی تھی۔ ان کے مطب میں طلبہ بھی رہتے تھے جو ان سے فیض اٹھاتے اور طبّی تجربات حاصل کرتے۔

طب یونانی کے فروغ کے لیے انھوں نے 'الکلیۃ الطبیۃ' کے نام سے ۱۹۰۴ء میں ایک طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کا آغاز ان کے ذاتی مکان محلّہ سبزی منڈی الٰہ آباد

سے ہوا۔اس کے لیے باقاعدہ نصابِ تعلیم وضع کیا گیا،جس کی مدت چار سال تھی، ذریعہ تعلیم عربی اور اردو زبان تھی۔طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا تو مدرسہ دوسری عمارت میں منتقل ہوگیا، پھر ترقی کرتے کرتے اس نے ۱۹۲۷ء میں ایک بڑے کالج کی حیثیت حاصل کرلی اور یونانی میڈیکل اسکول الٰہ آباد کے نام سے بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی لکھنؤ سے اس کا الحاق ہوگیا اور حکیم احمد حسین بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی کے اولین نامزد ممبر منتخب ہوئے۔[۶] جنوری ۱۹۳۳ء میں حکیم صاحب کی وفات ہوئی۔

معاصرین کا اعتراف

حکیم احمد حسین کے معاصرین ان کے علم وفضل کے معترف تھے۔علمی حلقوں میں ان کا شہرہ تھا۔ یہاں صرف حکیم سید عبدالحئی الحسنیؒ مؤلف نزھۃ الخواطر کی ایک عبارت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے، جس میں انھوں نے ان کے علم وفضل، مہارت فن اور ذہانت کا اعتراف کیا ہے:

> ''شیخ فاضل احمد حسین بن بدرالدین عثمانی حنفی الٰہ آبادی مشاہیر اور اصحاب علم وفضل میں سے تھے، ذہانت وفطانت میں بے نظیر اور روشن دماغ تھے۔طالب علمی کے زمانہ میں ایک عرصہ تک میری اور ان کی ملاقات رہی۔تاریخ وسیر میں ان کی کئی کتابیں ہیں، سوانح نورالدین محمود زنگی، سوانح صلاح الدین ایوبی اور تاریخ ابن خلدون مغربی کا ترجمہ ان کی (یادگار) کتابیں ہیں''۔[۷]

حکیم احمد حسین کو ان کی طبی خدمات کے علاوہ ان کے تصنیفی وتالیفی کارناموں نے حیات جاوید عطا کی۔تاریخ ابن خلدون کے ترجمہ کے ساتھ ان کی دو اور کتابیں ہیں: حیات نورالدین محمود زنگی اور حیات صلاح الدین ایوبی۔ابن خلکان کے ترجمہ کا بھی ارادہ تھا، لیکن اس ارادہ کو عملی شکل دینے کی نوبت نہ آسکی۔

تاریخ ابن خلدون کی اہمیت

ابن خلدون تاریخ میں ایک ایسا نام ہے جس نے عرب وعجم اور مغرب ومشرق

کو یکساں طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس کی تاریخ اور مقدمہ سے علوم وفنون کے نئے دریچے وا ہوئے۔ فکر وتخیل کو نئی راہیں ملیں، علمی موضوعات پر جدید فلسفیانہ بحثیں شروع ہوئیں اور فن تاریخ سائنٹفک اصولوں سے روشناس ہوا۔

مقدمہ میں ابن خلدون نے تاریخ، معاشرت، سیاست، ثقافت اور مذہب پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے اصول ومبادیات پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ مقدمہ کی اہمیت کی بنا پر مفکرین یورپ نے اس سے خوب استفادہ کیا ہے اور اس کے علمی مباحث سے خوشہ چینی کی ہے۔ اپنے تعصب کے باوجود مستشرقین ابن خلدون کی اصابت رائے اور فکر رسا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یورپ میں 'خلدونیات' پر ریسرچ ہونے لگی، اس سلسلہ میں چارلس عیسوی، روزن تھال، گاسٹن باؤتھول، ایچ آر گب اور والٹر جے فی شل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مقدمہ ابن خلدون کا فرانسیسی، انگریزی، جرمنی، اطالوی اور ترکی کے علاوہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ کسی زبان میں پورے مقدمہ کا ترجمہ ہوا تو کسی میں اس کے بعض اجزاء پر اکتفا کیا گیا۔

کاتر میر نے مقدمہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ انیسویں صدی میں وہ طبع ہوا، انگریزی میں چارلس عیسوی نے مقدمہ کے مختلف اقتباسات کا ترجمہ کیا۔ چارلس کا یہ ترجمہ کاتر میر (Quatremere) کے فرانسیسی ترجمہ سے مستفاد ہے۔ ارنسٹ روزن تھال (Earnst Rosenthal) کا انگریزی ترجمہ بھی منظر عام پر آیا ہے، لیکن ڈاکٹر بشارت علی استاد شعبۂ عمرانیات کراچی یونیورسٹی کے مطابق روزن تھال کے ترجمہ میں بہت سقم ہے۔ مترجم بعض مقامات پر ابن خلدون کی عبارتوں کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ اس نے جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔[۸]

مقدمہ کی طرح تاریخ ابن خلدون کا یورپی زبانوں میں مکمل یا جزوی ترجمہ ہوا ہے یا نہیں، اس کا علم نہیں۔ علامہ شبلی کی ایک تحریر سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۰۴ء تک لاطینی، فرنچ، جرمن اور انگریزی میں تاریخ ابن خلدون کا ترجمہ نہیں ہوسکا تھا۔ البتہ انیسویں صدی کے اواخر میں اس کے فارسی ترجمہ کی کوششوں کا پتا چلتا ہے۔ کابل کے امیر

عبدالرحمٰن خاں نے ہندوستان میں ایک محکمۂ تراجم قائم کرنا چاہا تھا، جو ہندوستان میں ہی رہ کر ہندوستانی فضلاء کے قلم سے فارسی میں علوم وفنون کا سرمایہ بہم پہنچاتا۔اس سلسلہ میں کابل کے سفیر نے مولانا حالؔی ، مولانا نذیر احمد اور علامہ شبلی سے رابطہ کیا۔ علامہ شبلی سے ابن خلدون کے ترجمہ کی درخواست کی گئی،لیکن انھوں نے معذرت کرلی۔مولانا حمیدالدین فراہی کے نام ۳؍جولائی ۱۸۹۹ء کے ایک مکتوب میں وہ اس بابت تحریر فرماتے ہیں:

''آج کل ایک بڑی ریاست بلکہ سلطنت سے ابن خلدون کے ترجمہ کا استفسار آیا تھا۔دس ہزار روپیہ نقد دیتے ہیں۔میں نے اپنی صحت کے لحاظ سے انکار کردیا۔''[۹]

تاریخ ابن خلدون کا اردو ترجمہ

تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمہ کا سہرا حکیم احمد حسین عثمانی کے سر جاتا ہے۔اس ترجمہ کے ذریعہ انھوں نے اردو زبان کو ایک ایسی کتاب دی جو مرجع (Reference Book) کی حیثیت رکھتی ہے۔منشی حامد حسین عثمانی اس کارنامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرت، بے انتہا مایوسی، غیر محدود صدمہ، ناقابل تلافی تاسف مسلمانان ہند کو اس وقت ہوتا جب کہ اس قابل قدر تاریخ کا ترجمہ اردو زبان میں نہ ہوتا، جو علاوہ اور اقوام کے سات کروڑ مسلمانوں کی مادری زبان ہونے کا شرف رکھتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ قوم کے سچے ہمدرد، ملّت کے حامی، اردو لٹریچر کے دائیں بازو، جناب حکیم مولوی احمد حسین صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی ذوالأیادی نے اس ضرورت کو محسوس کرکے اردو زبان میں ترجمہ کرنے پر ہمت باندھ لی۔حق تو یہ ہے کہ فاضل مترجم نے اس لاثانی کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کرکے اردو لٹریچر کے چار چاند لگادیئے اور ایک ضرورت کو ، جو اس

وقت تک پوری نہیں ہوئی تھی، پوری کردی.....زبان اردو میں اس وقت تک ایسی کسی معتبر کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا اور نہ ایسی کوئی کتاب موجود ہے جو عندالضرورۃ ریفرنس (حوالہ دینے) اور ماخذ بننے کے قابل ہو۔''[۱۰]

الہ آباد سے ایک رسالہ 'مبارکۃ الاسلام' کے نام سے حکیم احمد حسین کی ادارت میں نکلتا تھا۔ تاریخ ابن خلدون کے ترجمہ کی اشاعت ۱۸۹۷ء سے قسط وار اسی رسالہ میں شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں حکیم احمد حسین لکھتے ہیں:

''ترجمہ تاریخ ابن خلدون کی اشاعت کا سلسلہ ذریعۂ رسالہ مبارکۃ الاسلام ۱۸۹۷ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۰ء تک ختم ہوجاتا ہے۔ اس مدت میں گیارہ جلدیں ترجمہ کی شائع ہوئیں۔ بارہویں جلد ۱۹۱۱ء میں مکمل بشکل غیر مکمل خریداران رسالہ موصوف کی خدمات علیات میں تو پہنچ گئی، لیکن اس کی کتابی صورت کو شائقین نہ دیکھ سکے۔''[۱۱]

لیکن ۱۹۱۱ء کے بعد رسالہ 'مبارکہ الاسلام' کی اشاعت بند ہوگئی۔ موصوف اسی دیباچہ میں آگے تصریح کرتے ہیں:

''.....تکاثر مصائب اور مشاغل طبی کی وجہ سے رسالہ مشارٌ الیہ کو اپنی ادارت میں جاری نہ رکھ سکا۔''[۱۲]

تاریخ ابن خلدون (عربی) کی چھ جلدیں ہیں۔ حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ ان کا ترجمہ اٹھارہ جلدوں میں کریں گے، لیکن چودہ جلدیں ہی منظر عام پر آسکیں۔ یہ جلدیں حکیم احمد حسین صاحب کے بڑے بھائی منشی حامد حسین کے زیر اہتمام یونانی دواخانہ پریس الہ آباد سے شائع ہوئیں۔ چودہویں جلد 'شجرۂ ملوک خوارزم' پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملوک خوارزم کے بعد کا حصہ (چھٹی جلد) ترجمہ ہونے سے رہ گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تاریخ ابن خلدون کی جلد اول کا ایک اور ترجمہ لاہور سے ۱۹۸۸ء کے آس پاس شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب نے کیا

ہے۔لیکن ترجمہ کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ نفیس اکیڈمی نے حکیم احمد حسین کا ترجمہ حاصل کیا اور نظر ثانی اور تبویب وترتیب کے بعد اس کو شائع کیا ہے۔ چوں کہ حکیم احمد حسین صاحب تاریخ کا مکمل ترجمہ نہ کر سکے تھے، اس لیے سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین کے بعد کے حصے کے ترجمہ کی ذمہ داری نفیس اکیڈمی نے مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی کے سپرد کی۔

حکیم احمد حسین صاحب کا ترجمہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ ۶۳۴ھ تک کے واقعاتِ عالم ایک تسلسل کے ساتھ چودھویں جلد تک مل جاتے ہیں۔ تاریخ ابن خلدون کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وقت کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور ہم اسی دور میں پہنچ گئے ہیں۔

ترجمہ تاریخ ابن خلدون اپنے مضامین ومشتملات کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک نمایاں اضافہ ہے، اس کا احساس حکیم صاحب کو بھی تھا، لکھتے ہیں:

> ''.....تالیف امام علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون مغربی اشبیلی حضرمی (رحمۃ اللہ علیہ) کے ترجمہ کی دسویں جلد نے اردو لٹریچر میں ایک معقول اور بیّن اضافہ ہی نہیں کیا، بلکہ اس کی خوبی اور اوصاف کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس جلد کی سیر کرنے والوں کو بہت سے ایسے مضامین نظر آئیں گے جن سے اس وقت تک بہتیروں کے چشم وگوش آشنا نہیں ہوئے ہوں گے''۔[۱۳]

ابن خلدون کی نظر کسی واقعہ کے معمولی سے معمولی جزئیہ پر بھی رہتی ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ میں منظر نگاری پر خاص توجہ دی ہے، تاکہ واقعات وکردار کی حرکت وعمل سے قاری خود بھی نتائج حاصل کر سکے۔ مثلاً معرکۂ صفین کے بعد واقعۂ تحکیم کے موقع پر حَکَمَین حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی گفتگو کو ابن خلدون نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

''.....ابوموسیٰؓ اور عمرو بن العاصؓ میں اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی، عبداللہ

بن عمر خاموش، سکوت کے عالم میں آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے، عبداللہ ابن الزبیرؓ ان کے سامنے بیٹھے تھے، ابن الزبیرؓ منشأ گفتگو سمجھ گئے، عبداللہ بن عمرؓ کو ذرا چونکا دیا، ابن عمرؓ چلاّ اٹھے: واللہ میں اس معاملہ میں رشوت ہرگز نہ لوں گا.....''[۱۴]

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے یا کھولے ہوئے، یا عبداللہ بن زبیر نے ان کو چونکایا تو انھوں نے 'چلاّ' کر کہا۔ لیکن یہی تفصیل یعنی آنکھیں بند کرنا اور چلاّنا ماحول کی تخلیق کرتے ہیں اور ان تفصیلات سے نفس واقعہ کے مناسب پس منظر کی تعمیر ہوتی ہے۔

ترجمہ کا مقصد دراصل ترسیل و ابلاغ ہے۔ یعنی منشأ مصنف سمجھ کر اس کے مطابق تحریر آراستہ کی جائے۔ حکیم صاحب نے ترجمہ میں روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے، الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتی ہے اور محاوروں پر ان کی خاص نظر ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے اس کتاب کے ترجمہ کرنے میں ذرا بھی انشا پردازی نہیں کی اور نہ واقعات کے بیان کرنے میں شاعری سے کام لیا ہے۔ جس طرح سادہ طریقہ سے مؤرخ موصوف نے واقعات قلم بند کیے ہیں، اسی طرح روکھے پھیکے الفاظ میں نہایت سادگی سے ترجمہ کیا ہے''۔[۱۵]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے اپنے ترجمہ کو خاک ساری میں روکھا پھیکا کہا ہے۔ استعارات وتشبیہات سے گراں بار عبارتیں ہی انشا پردازی کا نمونہ نہیں ہوتیں سادگیٔ بیان ہو، ترسیل و ابلاغ ہو جائے اور مصنف وقاری کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جائے، یہی عبارت کی خوبی ہے اور یہی انشاء ہے۔ اس لیے حکیم صاحب کے اس ترجمہ کو انشا پردازی سے عاری نہیں کہا جا سکتا۔

ترسیل معانی کے لیے ضروری ہے کہ مترجم الفاظ کا انتخاب عبارت کے شایان شان کرے، تاکہ ترجمہ میں بھی وہی رنگ و آہنگ پیدا ہو جائے جو اصل عبارت میں ہے

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور ہو۔ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس پر بھی پوری قدرت رکھتا ہو اور جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس پر بھی اس کی گرفت مضبوط ہو۔ حکیم صاحب عربی سے صرف باخبر ہی نہیں تھے، بلکہ اس پر اہل زبان کی طرح دست رس رکھتے تھے۔ اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انھوں نے تاریخ ابن خلدون جیسی کتاب کا سہل اور آسان زبان میں ترجمہ کیا۔ ابن خلدون کی عبارت کو سمجھنا، اس کی مراد ومنشا تک رسائی حاصل کرنا، پھر عربی ثقافت وتہذیب میں ان الفاظ وتعبیرات کے پہلوؤں کو نظر میں رکھنا کسی اوسط استعداد والے آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ نمونہ کے طور پر ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"كانت مدينة بغداد قد احتفلت فی كثرة العمران بما لم تنته اليه مدينة فی العالم منذ مبدء الخليقة فيما علمناه ، واضطربت آخر الدولة العباسية بالفتن وكثر فيها المفسدون والدعار والعيارون من الرها، وأعيا على الحكام أمرهم، وربما أركبوا العساكر لقتالهم ويشخنون فيهم فلم يحسم ذلک من عللهم شيئاً– وربما حدثت الفتن من أهل السنة والشيعة من الخلاف فی الإمامة ومذاهبها، وبين الحنابلة والشافعية وغيرهم من تصريح الحنابلة بالتشبيه فی الذات والصفات، ونسبتهم ذلک الى الامام أحمد و حاشاه منه فيقع الجدال والنكير، ثم يفضی الى الفتنة بين العوام، و تكرر ذلک منذ حجر الخلفاء، ولا يقدر بنو بويه ولا السلجوقية على حسم ذلک منها، لسكنى أولئک بفارس، وهؤلاء باصبهان."[۱۶]

(دارالخلافت بغداد کیا بہ لحاظ آبادی اور کیا بنظر عمارات اس درجہ پر پہنچ گیا تھا کہ اس حد تک جیسا کہ ہماری محدود واقفیت شہادت دیتی ہے کہ

ابتداء آفرینش سے دنیا کا کوئی شہر نہ پہنچا ہو، مگر، بحکم ہر کمالے را زوالے، دولت عباسیہ کے قوائے حکمرانی کم زور و مضمحل ہوجانے سے فتنہ وفساد کا مخزن اور معدن بن گیا تھا، فتنہ پردازوں، چوروں اور بدمعاشوں کی وہ کثرت ہوگئی تھی کہ حکام وقت ان کی سرکوبی اور گوش مالی سے عاجز آ گئے تھے، بسا اوقات شاہی لشکر ان سے جنگ وجدال کرنے کو تیار (کذا) ہوکر جاتا اور بغیر اس کے ان کی مدافعت کرتا واپس آتا تھا اور گاہے گاہے باشندگان بغداد کے اختلاف مذاہب کی وجہ سے فتنہ وفساد کا دروازہ ہی کھل جاتا تھا، کبھی اہل سنت و جماعت اور شیعہ بوجہ اختلاف مذہب وعقائد جھگڑ جاتے تھے، کبھی حنبلیوں اور شافعیوں میں فساد ہوجاتا تھا، کیونکہ حنبلی باری تعالیٰ کی ذات وصفات میں صراحۃً تشبیہ دیتے تھے، ان کا یہ خیال ہے کہ امام احمد بن حنبل کی یہ رائے ہے، حالانکہ وہ اس سے بری ہیں اور شافعیہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ نوبت جدال وقتال کو پہنچ جاتی تھی، رفتہ رفتہ یہ فتنہ وفساد عوام تک پہنچ جاتا، جس کا انسداد غیر ممکن تھا، ایسے فسادات بکرات ومرات ہوتے رہے، خلفاء عباسیہ تو بے کار ہی ہوگئے تھے، امراء بنو بویہ اور ملوک سلجوقیہ بھی اس آگ کے بجھانے پر قادر نہ ہوسکے، اس وجہ سے کہ بنی بویہ فارس میں رہتے تھے اور ملوک سلجوقیہ اصفہان میں۔)[۱۷]

تعلیقات وحواشی

حکیم احمد حسین نے ترجمہ میں دقّتِ نظر، تفحّصِ علمی، ژرف نگاہی اور صحیح مزاجِ تحقیق سے کام لیا ہے۔ ان کی حیثیت مترجم کی کم، محقّق کی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان میں ترجمہ کے ضمن میں ایسے جواہر پارے جمع کردیے ہیں جن تک رسائی آسان نہ تھی۔ انھوں نے ترجمہ کے علاوہ تعلیقات وحواشی بھی لکھے ہیں، علمی موضوعات پر بحث کی ہے اور تحقیقی امور میں اپنی آراء پیش کی ہیں۔

یہ تعلیقات وحواشی بجائے خود ایک علمی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے حاشیہ لکھنے میں ضرورت کے مطابق اختصار وتفصیل سے کام لیا ہے۔ بعض مقامات پر طویل نوٹ لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ابن خلدون (عربی) کی پانچ جلدوں کا ترجمہ چودہ جلدوں میں ہوا ہے۔ حکیم صاحب اپنے مفصل ترجمہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''..... اگرچہ علامہ مورخ نے اسلامی تاریخ کو بھی اور واقعات کی طرح کسی قدر اختصار کے ساتھ لکھا ہے، لیکن میں نے ان کو بغرضِ انبساطِ قدر دانانِ فن تاریخ نہایت بسط وتفصیل سے تحریر کیا ہے جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۸۴ صفحات کا ترجمہ ۳۵۲ صفحات میں کیا گیا ہے۔''[۱۸]

سطور ذیل میں مختلف پہلوؤں سے ان تعلیقات کا جائزہ لیا جارہا ہے:

(۱) تاریخ پر تنقیدی نگاہ

حکیم احمد حسین تاریخی پیچیدگیوں کو اس سلیقہ سے حل کرتے ہیں گویا تاریخ ہی ان کا میدان عمل ہے۔ سنین پر ان کی گہری نظر ہے۔ واقعات میں اختلاف کی صورت میں وہ ان کے درمیان تطبیق دیتے ہیں، یا اپنی رائے کو پورے وثوق کے ساتھ رکھتے ہیں اور جو بھی رائے ظاہر کرتے ہیں، اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(الف) 'اجتماع حکمین اور فیصلہ' کے عنوان کے تحت ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ابوموسیٰ مجلسِ حکم سے نکل کر مکہ چلے گئے اور عمرو بن العاصؓ مع اہل شام، شام کی طرف واپس ہوئے۔ معاویہؓ سے کل ماجرا بیان کر کے خلافت سپرد کردی۔ ابن عباسؓ اور شریح امیر المومنین علیؓ کی خدمت میں آئے اور کل واقعہ بیان کیا۔ امیر المومنین علیؓ نماز میں قنوت پڑھنے اور بددعا کرنے لگے- **اللھم العن معاویة وعمرواً و حبیباً وعبدالرحمن بن مخلد والضحاک بن قیس والولید وابا الاعور** -معاویہ کو جب اس کی خبر لگی تو وہ بھی علیؓ و ابن عباسؓ و حسنؓ و

حسینؓ واشتر پر لعن کرنے لگے''۔

اس اقتباس پر علامہ موصوف نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس واقعہ کی تردید کی ہے اور صاف صاف لکھا ہے ان هٰذا لم یصح اور علامہ نصر نے لکھا ہے کہ اگر یہ دعا ایک حد تک صحیح مان بھی لی جائے تو غالباً بغیر لعن کی تھی۔ حقیقت میں یہ امر خلافتِ شانِ جناب امیر علیہ السلام معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی طرح سے بیٹھے ہوئے کو سنا دیا کریں۔ میرے خیال میں جہاں تک مجھے تفحص سے معلوم ہوا ہے، نہ تو امیر المومنین علی نے معاویہ پر لعن کیا اور نہ معاویہ نے جناب موصوف پر۔ یہ لوگوں کا حاشیہ ہے۔ واللہ اعلم''۔[۱۹]

(ب) مصر پر فوج کشی کب ہوئی تھی؟ اس کے بارے میں علامہ ابن خلدون نے مختلف سنین ذکر کیے ہیں: ''اسلامی فوجیں ۲۰ھ یا ۲۱ھ یا ۲۲ھ یا ۲۵ھ میں مصر کی طرف روانہ ہوئیں۔'' یہی اختلاف فتحِ مصر کے زمانے کے سلسلے میں بھی ہے۔ حکیم صاحب تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں فتح مصر کی تعیین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعضے کہتے ہیں کہ عمرو بن العاصؓ نے مصر و اسکندریہ ۲۵ھ اور بعضے کہتے ہیں کہ ۱۶ھ میں فتح کیا ہے، لیکن میرے نزدیک، جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے، مصر کو قبل عام الرماد (یعنی زمانۂ قحط) مفتوح ہونا چاہیے، کیونکہ عمرو بن العاصؓ نے مصر سے براہ بحر قلزم غلّہ کے جہازات روانہ کیے تھے اور قحط ۱۸ھ میں پڑا تھا، اس بنا پر ۱۶ھ کی روایت صحیح و قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔''[۲۰]

(ج) فتح دہلی کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون نے آخر میں لکھا: ''وذلک کله سنة ثمان و أربعین و خمسمائه.'' (یہ سارے واقعات ۵۴۸ھ کے ہیں۔) لیکن فاضل مترجم نے اس سے اختلاف کیا اور لکھا کہ یہ سارے واقعات ۵۴۸ھ کے نہیں، بلکہ ۵۸۴ھ کے ہیں، کیونکہ ۵۷۹ھ تک لاہور آخری فرمانروائے ملوک غزنیہ خسرو

ملک کے قبضہ میں تھا اور یہ لڑائی لاہور پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ہوئی تھی۔[۲۱]

(۲) لغوی تحقیق

حکیم عثمانی کی عربی الفاظ و تعبیرات پر بھی گہری نظر تھی۔ چنانچہ وہ دوران ترجمہ غریب و نادر الفاظ کی تشریح کرتے چلتے ہیں۔ اس سلسلہ کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(الف) تاریخ ابن خلدون میں ایک جگہ یہ عبارت ہے:

"وقیل أن قتیبة قدم خراسان سنة خمسین و ثمانین و کان من ذلک السُبیّ امرأة برمک"۔[۲۲]

لفظ 'برمک' کی تحقیق کرتے ہوئے فاضل مترجم لکھتے ہیں:

"برمک لفظ فارسی ہے جو اصل میں برمغ تھا، مغ کے معنی 'آتش پرست' کے ہیں، جب 'بر' کو 'مغ' کی طرف مضاف کیا تو اس کے معنی ہوئے 'مغچے' یا مغ کے چیلے یا مغ کے لڑکے۔ لیکن چونکہ مغ وہ شخص بنایا جاتا تھا جو تارک الدنیا ہوتا تھا تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مغچے یا مغزادہ کا مفہوم ہی نہ تھا تو اس کے لیے 'برمغ' کیسے موضوع ہوا؟ جواب یہ ہے کہ مغ قبل مغ ہونے کے شادی کرتے تھے، آل و اولاد ہوتی تھی، لیکن جب وہ مغ بنائے جاتے تھے تو تعلقاتِ دنیا ترک کر دیتے تھے، پس ان کی اولاد، جو مغ ہونے کے پیش تر ہوتی تھی، اسی کو برمغ کہا کرتے تھے، جس کو عرب نے اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال کر برمک کر دیا۔"[۲۳]

(ب) 'قتل معاویہ' عنوان کے تحت لفظ 'حُجَّاب' آیا ہے۔ اس لفظ کی تشریح میں علامہ عثمانی لکھتے ہیں کہ 'حجاب' 'حاجب' کی جمع ہے۔ ترکی میں یہ عہدہ رئیس التشریفات کے نام سے موسوم ہے اور انگریزی میں لارڈ چیمبرلین کہلاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو شخص دربار شاہی میں حاضر ہوتا ہے اس کی یہ تقریب کرتا ہے۔[۲۴]

(ج) 'حصون مخلاف' کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ حصون حصن کی جمع ہے، حصن قلعہ کو کہتے ہیں۔ مخلاف ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں امراء و سلاطین موسم گرما یا سرما میں بغرض تبدیلیٔ آب و ہوا جایا کرتے تھے۔[۲۵]

(۳) اضافے:

تاریخ ابن خلدون میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں مصنف ایجاز واختصار کے پیش نظر اشارہ کر کے گزر گئے ہیں۔ فاضل مترجم نے ایسے مقامات پر حسب ضرورت اضافے کیے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض جگہوں پر ابن خلدون نے سنین درج نہیں کیے تھے۔ مترجم نے وقت ضرورت وہاں سنین درج کر دیے ہیں۔ جس نسخہ سے وہ ترجمہ کر رہے تھے اگر وہاں کوئی عبارت محذوف ملی تو اس حصہ پر یہ علامت ''.....'' لگا دی ہے اور اس کو یونہی چھوڑ دیا ہے۔ اپنے حواشی وتعلیقات میں موصوف نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ جو کچھ بھی تحریر کریں وہ مشہور، مستند اور متداول مآخذ سے ہو۔ ابن اثیر کی الکامل، ابن عبدربہ کی العقد الفرید، سیوطی کی تاریخ الخلفاء اور ابن قتیبہ کی المعارف ان کے مآخذ ہیں۔ اس سلسلہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) ترجمہ تاریخ ابن خلدون جلد دوازدہم صفحہ ۱۳۱ کی ایک عبارت ہے: ''امیر بخارا نے خلف کی سرکوبی کو فوجیں روانہ کیں جس کا سردار.....تھا۔'' یہاں سردار کا نام درج نہیں ہے۔ مترجم موصوف نے تاریخ الکامل کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس سردار کا نام حسین بن طاہر بن حسین تھا۔

(ب) ایک جگہ علامہ ابن خلدون نے کچھ واقعات بیان کیے ہیں، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ واقعات کب کے ہیں۔ مترجم نے سنہ کی تعیین کی کہ: ''یہ کل واقعات ۳۱۶ھ کے ہیں، دیکھو تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۸، مطبوعہ مصر۔''[۲۶]

(ج) ایک جگہ یہ درج ہے: ''ملک طغرل کے ہوش جاتے رہے، تبریز سے 'خُونج' کی جانب کوچ کر دیا۔ حوصلے پست ہو گئے۔ عزم میں تذبذب پیدا ہو گیا۔''

فاضل مترجم نے 'خُونج' پر حاشیہ لکھا: ''تاریخ ابن خلدون میں اس جگہ پر کچھ نہیں لکھا ہوا ہے میں نے یہ نام تاریخ کامل ابن اثیر سے نقل کیا ہے۔''[۲۷]

یہاں قابل ذکر ہے کہ راقم سطور نے جب تاریخ ابن خلدون کے عربی نسخہ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ایڈیشن ۱۹۹۲ء سے اس ترجمہ کا مقابلہ کیا تو وہاں 'خونج' لکھا ہوا پایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کے وقت مترجم کے پیش نظر تاریخ ابن خلدون (عربی) کا ایک ہی نسخہ تھا، اگر ایک سے زائد نسخے ہوتے تو کسی نہ کسی نسخے میں 'خونج' ضرور لکھا ہوا مل جاتا اور اس کے لیے انھیں ابن اثیر کا حوالہ نہ دینا پڑتا۔ اگر ایک سے زائد نسخے ان کے پیش نظر ہوتے تو مقامات کی بھی تصحیح ہو جاتی، جہاں حکیم صاحب کے نسخے میں خالی جگہیں تھیں۔

(۴) تحقیق رجال

تاریخ ابن خلدون میں بعض مقامات پر غلط نام درج ہو گئے تھے یا بعض افراد کی ولدیت غلط لکھی ہوئی تھی۔ مترجم نے ان کی تصحیح کر دی ہے۔ اگر نام میں کوئی اشتباہ تھا تو اس کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ اگر کہیں ابن خلدون نے صرف نام پر اکتفا کیا ہے تو حسب ضرورت مترجم نے اس کا مختصر تعارف بھی کرا دیا ہے۔ اس سلسلہ کی چند مثالیں پیش ہیں:

(الف) عربی متن میں امیر ارسوس نام کے ایک شخص کا تذکرہ آیا ہے۔ مترجم نے امیر ارسوس پر یہ حاشیہ لگایا ہے: ''یہ کتابت کی غلطی ہے، ارسوس نام نہ تھا بلکہ ارتق نام تھا۔ یہ وہی ہے جس نے معرکہ آمد میں شرف الدولہ مسلم بن قریش کو کچھ لے کر نکل جانے دیا تھا۔'' ۲۸

(ب) متن میں ایک جگہ 'تاج الرؤسا ابن رحلات' آیا ہے۔

مترجم موصوف نے اس پر ریمارک لگایا ہے: ''یہ کتابت کی غلطی ہے، تاج الرؤسا کے باپ کا نام موصلایا تھا''۔ ۲۹

(ج) ایک جگہ یہ عبارت ہے: ''شہاب الدین نے اپنے گورنر لاہور بن محمد بن ابوعلی کو لکھ بھیجا کہ ککر سے سالانہ خراج وصول کر کے بھیج دو اور بدنظمیوں کو دفع کر کے امن وامان قائم کر دو۔ ککر نے محمد بن ابوعلی کی سماعت نہ کی، تب شہاب الدین نے اپنے غلام ایبک کو ککر کی سرکوبی اور سمجھانے بجھانے کو روانہ کیا۔''

مترجم نے ایبک پر حاشیہ لگایا کہ: ''یہ ایبک وہ نہیں ہے جس نے ملتان پر بحیلۂ مکر قبضہ حاصل کیا تھا، بلکہ یہ قطب الدین ایبک ہے جس نے دہلی میں بادشاہت کی تھی۔'' ۳۰

(۵) تاریخی مقامات پر نظر

فاضل مترجم ترجمہ کے دوران مختلف اماکن وامصار اور تاریخی مقامات کا تعارف بھی کراتے گئے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(الف) متن میں 'زلاّقہ' نام کی ایک جگہ کا تذکرہ آیا ہے۔ مترجم موصوف نے اس ذیل میں لکھا ہے کہ: 'زلاّقہ' اس میدان کا نام ہے جو دریائے دجلہ اور جزیرہ کے درمیان تھا۔[۳۱]

(ب) ایک جگہ 'فرما' نام کی ایک جگہ کا تذکرہ ہے۔ مترجم نے حاشیہ میں اس کے بارے میں لکھا کہ: ''فرما ایک شہر ہے جو بحر روم کے کنارے پر واقع ہے اور کسی زمانہ میں آباد تھا، جالینوس کی رصد گاہ۔''[۳۲]

(ج) ایک جگہ ایک مقام 'کوثی' کا ذکر آیا ہے۔ حکیم صاحب اس کے تعارف میں لکھتے ہیں: ''کوثی ایک مشہور تاریخی نام ہے۔ نمرود نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو یہیں قید کیا تھا۔ قید خانہ کی جگہ اس وقت تک محفوظ تھی۔ سعدؓ اس کے دیکھنے کو گئے اور درود پڑھ کر یہ آیت پڑھی: تِلْکَ الأَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ''۔[۳۳]

اردو کا دامن تاریخ ابن خلدون جیسے اہم علمی ماخذ سے خالی تھا۔ علامہ حکیم احمد حسین نے اس خزانۂ علمی کو اردو میں منتقل کر کے اردو ادب کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد کی۔ ابن خلدون کا ترجمہ تاریخ ساز بھی تھا اور اردو ادب کی تاریخ کا رہنما اور مشعل بردار بھی۔

حواشی ومراجع

۱ بہت سے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حکیم احمد حسین نے کان پور میں مولانا احمد حسین سے استفادہ کیا، لیکن مولانا سید عبدالحئ صاحب نے تحریر فرمایا کہ کان پور میں حکیم صاحب کے استاد گرامی قدر مولانا احمد حسن تھے۔ (نزہۃ الخواطر، ۸: ۴۹) یعنی حسن اور حسین کا فرق ہے۔ مولانا عبدالحئ صاحب کی بات زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ مولانا محمد حسن کانپوری کو اس وقت مرجعیت حاصل تھی۔ درسیات میں آپ کو کمال حاصل تھا، دور دراز علاقوں تک آپ کی شہرت تھی۔

۲ تذکرہ خاندان عثمانی، ڈاکٹر سعد عثمانی، عثمانیہ اکیڈمی الہ آباد، طبع اول ۱۹۸۷ء، ص ۸-۹

۳۔ اطباء اور ان کی مسیحائی، حکیم محمد مختار اصلاحی، اصلاحی یونانی طبی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، طبع اول ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۴

۴۔ تذکرہ خاندان عثمانی، ص ۲۰

۵۔ طبی مہارت کے بعض واقعات کے لیے ملاحظہ کیجیے: اطباء اور ان کی مسیحائی، ص ۱۸۵، ہندوستان کے مشہور اطباء، حکیم سید حبیب الرحمٰن، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، طبع اول ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۷-۲۰۸، تاریخ طب، سید محمد حسان نگرامی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، طبع سوم، ۱۹۹۹ء، ص ۴۹۳-۴۹۴

۶۔ حکیم حماد عثمانی- شخصیت اور خدمات، مرتبہ حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی ، عثمانیہ اکیڈمی الٰہ آباد، بار اول ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۰

۷۔ نزہۃ الخواطر ، مولانا سید عبدالحئ الحسنی ، مطبوعہ طیب اکیڈمی ملتان، پاکستانی ایڈیشن ۱۹۹۳ء، ۸/ ۴۹، یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ حکیم احمد حسین عثمانی اور ان کے والد حنفی نہیں تھے، بلکہ یہ لوگ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ممکن ہے کہ مولانا عبدالحئ کے حنفی لکھنے کی وجہ یہ رہی ہو کہ حکیم احمد حسین کے اجداد (والد سے اوپر کے لوگ) حنفی تھے، اسی بنا پر انھوں نے حنفی لکھ دیا ہو۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ کیجیے اقوال سلف ۴: ۲۲۶، مصنفہ مولانا محمد قمر الزماں الٰہ آبادی۔

۸۔ مقدمہ ابن خلدون، مترجمہ مولانا راغب رحمانی

۹۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۳۴۱

۱۰۔ سوانح عبدالرحمٰن ابن خلدون، منشی حامد حسین، یونانی دواخانہ پریس، ص ۸

۱۱۔ ترجمہ تاریخ ابن خلدون (دیباچہ)، حکیم احمد حسین یونانی دواخانہ پریس الٰہ آباد، ۱۳۴۵ھ، ۱/۱۲

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ترجمہ تاریخ ابن خلدون، جلد دہم، یونانی دواخانہ پریس الٰہ آباد، ۱۹۲۷ء، (دیباچہ)

۱۴۔ ایضاً، طبع سوم، ۱۳۴۸ھ، ۴/ ۳۲۹

۱۵۔ ایضاً، ۲/۱۲

۱۶۔ تاریخ ابن خلدون، عبدالرحمٰن ابن خلدون ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ایڈیشن ۱۹۹۲ء، ۳/ ۵۸۰-۵۸۱

۱۷ ترجمہ تاریخ ابن خلدون، ۹/ ۳۱-۳۲
۱۸ ترجمہ تاریخ ابن خلدون، مطبوعہ ادارہ الرشید دیوبند ایڈیشن ۱۹۸۸ء، ۱/ ۲۷
۱۹ ترجمہ تاریخ ابن خلدون، ۴/ ۳۳۰-۳۳۱ ۲۰ ایضاً، ۴/ ۱۱۱
۲۱ ایضاً، ۱۳/ ۱۰-۱۱ ۲۲ ایضاً، ۱۳/ ۷
۲۳ تاریخ ابن خلدون، ۵/ ۱۷ ۲۴ ترجمہ تاریخ خلدون، ۵/ ۲۴۷-۲۴۸
۲۵ ایضاً، ص ۵۲ ۲۶ ایضاً، ۱۱: ۱۹۰
۲۷ ایضاً، ۱۲/ ۱۶۰ ۲۸ ایضاً، ۱۴/ ۱۴۶
۲۹ ایضاً، ۱۴/ ۱۷، ایڈیشن ۱۹۳۰ء ۳۰ ایضاً، ص ۸۶
۳۱ ایضاً، ۱۳/ ۳۳ ۳۲ ایضاً، ۱۴/ ۱۵۷
۳۳ ایضاً، ۴/ ۱۱۱ ۳۴ ایضاً، ۴/ ۵۶

آزادیٔ فکر ونظر اور اسلام

مولانا سلطان احمد اصلاحی

آزادیٔ فکر ونظر دورِ حاضر کی ایک مسلّمہ قدر ہے جس کے حوالہ سے آج کا انسان اسلام سمیت دنیا کے تمام افکار ومذاہب پر تنقید کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اسی طرح بین مذہبی گفتگو کا بھی اسے لازمی حصّہ سمجھا جاتا ہے کہ دیگر مذاہب ہی کی طرح اسلام پر بھی آدمی کو بھرپور تنقید کا حق ملے۔

اسلام دیگر مذاہب وافکار پر کھل کر تنقید کرنے اور ان کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کرنے کو اپنا حق سمجھتا ہے، لیکن دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام پر اظہار خیال کرنے میں کچھ حدود کا پابند بناتا ہے۔

اس کتاب میں زیر بحث موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل اور مدلّل بحث کی گئی ہے جس سے ایک اہم دعوتی ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے۔

آفسیٹ کی خوبصورت طباعت، عمدہ ٹائٹل، صفحات: ۱۲۸ قیمت =/۴۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

ترجمہ و تلخیص

علم سیاست میں اسلامی علمی سرمایہ

ڈاکٹر عثمان بن جمعۃ ضمیریۃ

مترجم: ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

علم سیاست اور سیاسی فکر قدیم علم بھی ہے اور جدید بھی۔ یا قدیم خیال اور قدیم منہج کا جدید علم ہے، اس لیے کہ تمام اقوامِ عالم اور انسانی معاشروں میں سے کوئی بھی ایسے مجموعۂ قوانین سے مستغنی نہیں ہوسکتا جو حاکم و محکوم کے درمیان تعلق کی تنظیم کرے اور لوگوں کے مطلوب 'مدینۂ فاضلۃ' کی بنیاد رکھے، تاکہ ان کو امن و اطمینان نصیب ہو، مظلوم کو انصاف ملے، زیادتی کرنے والے کی زیادتی کا خاتمہ ہو، عدل و انصاف کا قیام ہو اور سماج کے دنیاوی امور کی درستگی اور حسنِ تدبیر و انتظام کی ضرورت پوری ہو۔

سیاسی فکر کے ارتقاء کا مطالعہ کسی بھی محقق کو سیاسی تاریخ کے مراحل میں سے عصر جدید کے آخری مرحلہ کی طرف متوجہ کرتا ہے، جس میں مختلف سیاسی نظام نکھر کر سامنے آئے۔ اس لیے اس مقالہ میں پہلے معاصر سیاسی فکر کے اہم رجحانات اور نکات پر بحث کی جائے گی پھر اسلامی سیاسی فکر کا جائزہ لیا جائے گا۔

عصر جدید میں علم سیاست

سیاسی امور، نظام ہائے حکومت، آزادیاں، حقوق اور ان سے متعلق مسائل وہ نمایاں پہلو ہیں جن کو عصر جدید میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ جنگ عظیم اول اور اس کے بعد مقامی معاشروں میں اندرونی اضطرابات اور عالمی و قومی کش مکش جنگ عظیم دوم کا سبب بنیں اور ان کے اثرات سیاسی و اقتصادی میدانوں میں عالمی سطح پر مرتب ہوئے۔ اس وقت انسانیت کو ہلاکت و بربادی کے خطرات سے بچانے کے لیے علماء و مفکرین و مصلحین کے متعدد اسالیب و مناہج سامنے آئے اور علم سیاست پر زیادہ توجہ دی جانے

لگی۔ کچھ لوگوں نے سیاسی نظاموں اور اسالیبِ حکومت کی اصلاح کی مانگ کی، بعض لوگوں نے پُرامن طریقہ سے تنازعات کے حل کے لیے عالمی تعاون کی بات کی، دیگر لوگوں نے حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کا مسئلہ اٹھایا۔ اس طرح مختلف دستوری نظام اور سیاسی رجحانات ظاہر ہوئے۔

سیاسی نظریہ کا مضمون

علوم سیاست کے مختلف مناہج پائے جاتے ہیں اور سیاست، علم سیاست اور اس کے مضمون و موضوعات میں اس فن کے ماہرین کے مابین شدید اختلافات موجود ہیں۔ بہت سے ماہرین نے یونیسکو (UNESCO) تنظیم کی شائع کردہ علم سیاست اور اس کی تعلیم کی فنّی تالیف پر اعتماد کیا ہے، جس میں حکومت اور نظام حکومت کی تدریس کے لیے درجِ ذیل موضوعات شامل ہیں:

۱- سیاسی نظریہ کا اصول اور گذشتہ صدیوں میں حکومت اور اس کی سرگرمیوں سے متعلق سیاسی افکار کی تاریخ۔

۲- نظامہائے سیاسی: اس علم میں حکومت کے ادارے، جیسے دستور، حکومت، انتظام اور نظام ہائے سیاسی کے مابین موازنہ پڑھایا جاتا ہے۔

۳- سیاسی زندگی: اس میں جماعتیں، گروہ، دباؤ کی لابیاں اور رائے عامہ شامل ہیں۔

۴- بین الاقوامی تعلقات: اس میں عالمی سیاست، بین الاقوامی تنظیم، عالمی قانون اور ان سے متعلق قوانین شامل ہیں۔[۱]

معاصر نظاموں میں مذہب اور ریاست

سیاسی اصلاح کے لیے اہل مغرب نے مختلف نظام اور مناہج اختیار کیے ہیں، لیکن وہ سب اللہ کے دین اور اس کی شریعت سے جدا ہیں۔ یوروپ نے ایک طرف چرچ اور اہل اقتدار کے مابین، دوسری طرف چرچ اور سائنس دانوں کے درمیان طویل و تلخ کش مکش کے بعد اپنی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد لامذہبیت ہی پر نہیں، بلکہ مذہب دشمنی پر رکھی۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ یوروپ کو اس

مذہب کا بڑا سخت تجربہ ہوا تھا جو ان کو اس کے پیروکاروں کے ہاتھوں تحریف شدہ شکل میں پہنچا تھا۔ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں تبدیلی اس وقت ہوئی جب سینٹ پال نے عقیدہ میں تحریف کی، اس کے بعد عقیدہ اور شریعت میں تفریق پیدا کر دی گئی۔ اس کی وجہ سے دین، شریعت کے بغیر صرف عقیدہ یا انسان اور اس کے رب کے مابین محض وجدان کی حیثیت سے باقی رہ گیا، جس کا زندگی کے سیاسی، معاشی اور سماجی پہلوؤں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سب ایک ایسے نعرے کے ساتھ ہوا جس کی اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے دین میں کوئی سند نہیں تھی، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب یہ قول کہ ''قیصر کا حق قیصر کو دو اور اللہ کا حق اللہ کو''، پھر علمائے دین کاہن اور دین کے (پیشہ ور) آدمی بن کر انسان اور اللہ کے درمیان واسطہ (ایجنٹ) میں تبدیل ہو گئے اور ان کو ایسا اقتدار نصیب ہوا کہ عوام پر دست درازی کرنے لگے، چرچ کا اقتدار انسانوں کی ارواح و اجسام اور اموال و عقول پر مسلط ہو گیا اور اس نے سائنس دانوں اور ان کی ابھرتی ہوئی علمی تحریک کے خلاف ظالمانہ موقف اختیار کیا۔

دوسری جانب چرچ ان بادشاہوں اور جاگیرداروں کا طرف دار بن گیا جو عوام پر اور اپنے علاقوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کو بدترین عذاب دیتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ مذہب اپنی موجودہ صورت میں اور اپنے علم برداروں کے ظالمانہ رویّے کی وجہ سے ظلم و جہالت کی دعوت کے سوا کچھ نہیں ہے اور وہ آزادی و ترقی کی راہ کا روڑا ہے۔ اس صورت حال میں فطری طور پر سائنس اور نشأۃ ثانیہ کے علم برداروں اور چرچ اور اس کے نمائندوں کے درمیان طویل کش مکش برپا ہوئی، چرچ اور ظالم و جابر ملوکیت کے خلاف بغاوتیں ہوئیں، جن کا مشہور نعرہ تھا: إشنقوا آخِر ملک بأمعاء آخر قسیس (آخری بادشاہ کو آخری پادری کی انتڑیوں سے سولی دے دو) پھر جب یہ بغاوت کامیاب ہوئی تو فطری طور پر اس کے علم برداروں نے ریاست و حکومت اور نشأۃ ثانیہ کی بنیاد اس مذہب اور اس کی نمائندہ شخصیات سے بالکل الگ رکھیں جنھوں نے ان پر ظلم ڈھائے تھے، اس لیے ان کے

درمیان مذہب کو ریاست وحکومت سے الگ رکھنے کا خیال پیدا ہوا۲؎۔ غیر یورپی ممالک بھی اس خیال سے کم وبیش متأثر ہوئے اور انھوں نے اہل یورپ کی پیروی کی۔ کسی نے کم، کسی نے زیادہ۔

مسلم ممالک بھی اس تأثیر وتأثر اور مغربی مفکرین کی تقلید سے آزاد نہیں رہے۔ انھوں نے اگرچہ صلیبی عسکری سامراج سے آزادی حاصل کرلی، لیکن وہ ان کے فکری وسیاسی سامراج سے آزاد نہ ہوسکے، جس کے نتیجہ میں عام زندگی اور نظامِ حکومت وریاست سے شریعت علیٰحدہ کردی گئی اوران کے دستوروقانون میں صرف اس عبارت پر اکتفا کرلیا گیا کہ: ''ریاست کا سرکاری دین اسلام ہے اور قانون سازی کے مآخذ میں ایک مأخذ شریعت ہے'' جب کہ اس عبارت کا کوئی اثر حقیقی زندگی اور وضع کردہ قوانین میں نہیں پایا جاتا ۳؎ بلکہ بعض لوگوں نے تو آگے بڑھ کر اسلام میں ریاست وحکومت اور نظام حکومت کی موجودگی کا ہی انکار کردیا اور کچھ دیگر لوگوں نے کہا کہ: ''مذہب میں سیاست کو داخل نہ کیا جائے اور سیاست کو مذہب سے دور رکھا جائے''۔ بعض اہل قلم نے 'سیاسی اسلام' کی اصطلاح وضع کرلی۔ اس سے ان کا مقصد داعیانِ اسلام پر یہ الزام لگانا ہے کہ وہ دین کو سیاست میں داخل کرتے ہیں، جس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ گویا ان کے نزدیک اسلام دو ہیں: ایک سیاسی اسلام اور دوسرا غیر سیاسی اسلام۔ درحقیقت ان حضرات کے نزدیک مذہب انسانی خواہشات کا دوسرا نام ہے، وہ اللہ کی اتاری ہوئی وحی ہے نہ الٰہی نظام، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی تنظیم کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی صورتِ حال کے درمیان بہت سے پہلوؤں میں سرکاری اور قانونی سطح پر تناقض وتضاد عام ہوگیا اور مذکورہ بالا دستوری عبارت کی حیثیت کاغذ پر درج بے قیمت تحریر کی رہ گئی، بلکہ بسا اوقات غیر اسلامی قوانین کو شرعی جواز عطا کردیا گیا، ضعف وانتشار اور فساد وانحراف اور غیر اللہ کی بندگی عام ہوگئی اور امت کا وہ حال ہوگیا جو ہم سب کے سامنے ہے اور جس کی ہماری تاریخ کے سابق ادوار میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

سیاست واخلاق کے درمیان علیٰحدگی

پھر آج لوگوں کے ذہنوں میں سیاست مکر وفریب، مطلب پرستی، دوسروں کے حقوق پر دست درازی، کم زوروں پر طاقت وروں کے تسلط، چھوٹوں پر بڑوں کے غلبہ کا نام ہوگئی ہے۔ ان کے نزدیک انسانی اصولوں اور اخلاقی اقدار کا کوئی وزن نہیں ہے، نہ اس بات اور اس اصول کی عزّت و شرف باقی رہتی ہے جس نے ان کو امت کی قیادت کے منصب پر فائز کیا تھا اور جس کی بنیاد پر امت ان سے ایمان داری کے ساتھ ذمہ داری نباہنے کی امید کرتی ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علماء اور سماجی مصلحین سیاست سے دور بھاگتے ہیں، اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان رجحانات کا ظہور ہے جو دین واخلاق سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو سیاست سے چھین کر مطلق العنان استبدادی نظامِ حکومت کو مضبوط کرتے ہیں جس میں ایک بھائی دوسرے بھائی کا غلام بن جاتا ہے۔

چنانچہ اطالوی فلسفی نیقولا میکاولی (NICCOLO MACHIAVELLI (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء) نے اپنی مشہور کتاب THE PRINCE میں حکومت اور اخلاقیات میں عملی طور پر مکمل علیٰحدگی کر کے اخلاقی اصولوں سے سیاست کی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس نے اپنا یہ نقطۂ نظر عام کیا کہ امورِ سلطنت میں اخلاقی اصولوں کے نفاذ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس نے حکمراں کے لیے یہ جائز قرار دیا کہ وہ عام طور پر رحمت وشفقت اور انسانیت نوازی ودین داری کا مظاہرہ کرے، لیکن اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو وہ اس کے بالکل برعکس عمل کر سکتا ہے۔ اس کا مفروضہ تھا کہ انسان کا مزاج مطلب پرستی اور خود پسندی کا ہے، اس لیے اس نے سیاست دانوں کو نصیحت کی کہ عوام پر حکومت کے وقت اسی حقیقت کو اپنے پیش نظر رکھیں۔ اس کا خیال تھا کہ انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے شرارت پسند ہے اور عقل مند حکمراں کو اپنی سیاست کی بنیاد اسی نقطہ پر رکھنی چاہیے۔ بیرونی سیاست میں میکاولی چھوٹی ریاستوں کے مقابلہ میں بڑی سلطنتوں کی تشکیل کا قائل تھا۔ اسی طرح اس کا خیال تھا کہ حکمراں کو اپنے تصرّفات و اعمال میں انسان و حیوان

دونوں کے اسالیب کو جمع کرنا چاہیے۔ اگر حیوانی وسائل کی ضرورت پڑے تو اس کو لومڑی اور شیر کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔ اس کو بیک وقت لومڑی اور شیر بننا چاہیے۔ اگر وہ شیر نہیں ہوگا تو وہ اس جال کو ہرگز نہیں دیکھ سکے گا جو اس کے لیے نصب کیا جائے گا اور اگر وہ لومڑی نہ ہوا تو بھیڑیوں سے مقابلہ نہ کر سکے گا، اس لیے اس کو ایک ساتھ لومڑی اور شیر ہونا چاہیے، یہ بھی یاد رہے کہ وسائل کا نہیں بلکہ نتائج کا اعتبار ہوتا ہے، یعنی مقصد کا حصول وسیلہ کے جواز کے لیے کافی ہے۔[۴]

میکاولی کی تعلیمات عام ہوئیں تو ان کو یوروپ نے اپنایا، بادشاہوں اور فوجی قائدین نے انھیں اپنا شعار بنایا، سیاست دانوں کے رجحانات اخلاقی انارکی کی طرف مائل اور جعل وفریب، مکر و سازش کی بنیاد پر قائم ہوئے۔ اس کے نتیجے میں انتہائی ظلم، دھوکہ وسنگ دلی پر مبنی جنگیں برپا ہوئیں، جن میں عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور رحم مادر میں پرورش پانے والے جنینوں تک کو انتہائی سفاکی سے قتل کیا گیا، ممالک تباہ و برباد کیے گئے، زمین میں ہر طرح کا فساد پھیلایا گیا اور قیدیوں کو سخت ترین تکلیفیں دی گئیں، حتّٰی کہ انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

میکاولی کا تو ۱۵۲۷ء میں انتقال ہوگیا، لیکن اس کا مسلک اس کی موت کے تقریباً ایک صدی بعد تک یوروپی ممالک کے حکم رانوں میں رائج رہا، جنھوں نے اعلیٰ اخلاقی قیود وحدود سے آزاد ہوکر میکاولی فلسفہ کا خوش دلی سے استقبال کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مطلب پرستی اور ذاتی منفعت حکومت کا سیاسی شعار ہے۔ اگرچہ بعد میں بعض سیاست دانوں نے میکاولی کے خیالات وافکار کے خلاف جنگ بھی کی، لیکن وہ ازسرِ نو لوٹ کر آج دنیا کے بیش تر ممالک کا مقبولِ عام مذہب بن چکا ہے، چنانچہ آج ہم جو مطلب پرستی، خودغرضی، ظالمانہ تسلّط، دوہرے معیار کی بدولت عالمی سیاسی تعلقات میں انحراف، اعلیٰ اخلاقی اقدار سے محرومی دیکھتے ہیں وہ اسی نقطۂ نظر کے مظاہر ہیں۔[۵]

پھر تھامس ہوبز THOMAS HOBBES (۱۵۸۸-۱۶۷۹ء) آیا، جس نے انگلینڈ میں مذہبی کش مکش کے ساتھ پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان سیاسی کشاکش

بھی دیکھی تھی، اس نے LEVIATHAN کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست نے وحشی جانور بن کر بڑی طاقت حاصل کر لی ہے، اس ریاست میں کوئی انسان دیگر لوگوں سے علیٰحدہ ہو کر نہیں رہ سکتا، اس لیے ہر انسان دوسرے انسان کا مدّ مقابل (RIVAL) ہے، اس لحاظ سے ہر انسان دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا ہے۔ ہوبز کو بھی استبدادی نظامِ حکومت سے زیادہ مناسب کوئی نظام سمجھ میں نہیں آیا، اس لیے کہ بادشاہ ہی مطلق اقتدار کا مالک ہے، جو قوانین جاری کرتا اور ان کو منسوخ کرتا ہے، جب کہ خود ان کا پابند نہیں ہوتا، اس لیے کہ کوئی فرد خود بہ خود تو پابند ہونے سے رہا۔ ہوبز نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ چرچ کے عہدے داروں کو بھی اس صاحب اقتدار (بادشاہ) کے ماتحت کر دیا۔[۶]

جدید زمانوں میں یہ اور اس جیسے دیگر افکار یوروپ میں عام ہوئے۔ بعد میں ان کی کچھ مخالفت بھی ہوئی اور بعض مصلحین نے ان کے خلاف خطرہ کی گھنٹی بجائی اور بسا اوقات ان پر سخت حملے بھی کیے، لیکن عملی دنیا میں لوگ انہی اصولوں کو اپنا رہ نما بنائے رہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ معاصر عالمی سیاسی تعلقات میں ظلم و استبداد، تسلّط اور غلبہ، رسوخ و نفوذ کی کش مکش اور طاقت و قوت کے متنوع وسائل حاصل کرنے کی کوشش عام ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ بھی اپنی اندرونی سیاست میں بین الاقوامی سیاست کی ان ہی اخلاقی برائیوں کا شکار ہے۔

مسلمانوں میں سیاسی فکر

امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے خیرِ امت کی حیثیت سے برپا کیا ہے، تاکہ وہ معروف (بھلائی) کا حکم دے، منکر (برائی) سے روکے، اللہ پر ایمان لائے، لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کی میزان کو تھامے، دوسری امتوں کی رہ نمائی کرنے اور ان پر گواہ بننے کا کردار ادا کرے، پاکیزہ عقیدۂ توحید کے سایے میں انسانوں کی حریت و کرامت کی نگرانی اور ان کے تمام حقوق کی حفاظت کرے، تاکہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی، روحانی و مادی، دنیاوی و اخروی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس کے اثرات و ثمرات سے

فائدہ اٹھائیں، اپنے اندر اعلیٰ اخلاقی پہلوؤں کو پروان چڑھائیں اور تہذیب وتمدن اور مادی و ادبی تخلیقات میں اپنی جدّ وجہد کے نتائج وفوائد کی حفاظت کریں۔ اس لیے ضروری تھا کہ یہ امت اصلاح کا فریضہ انجام دے اور اپنی عزت وعظمت کے سرچشموں کی طرف لوٹے۔ اس کے لیے دین اسلام کی حقیقت بیان کرنے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والی بہت سی تحریریں دستیاب ہیں، جن میں مطالعہ وتحقیق اور تشریح و وضاحت کا حق ادا کیا گیا ہے اور دشمنوں کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان تحریروں میں سیاسی پہلو نمایاں ترین ہے، جس کا قدیم و جدید مسلم علماء و مفکرین نے بحث وتحقیق اور تالیف کے اعتبار سے حق ادا کیا ہے۔

سیاسی نظام سے متعلق علمائے اسلام کے مناہج بحث

سیاسی نظام یا اسلامی سیاسی فکر کے موضوع پر تصنیف وتالیف میں مؤلفین نے مختلف طریقے اور مناہج اختیار کیے ہیں:

۱- بعض علماء نے اسلام سے متعلق موسوعی کتاب میں سیاسی نظام کو ایک باب یا بحث کے طور پر ذکر کیا ہے، جب کہ کچھ علماء نے صرف سیاست یا ریاست کے موضوع پر پوری کتاب تصنیف کی اور چند نے اس کے کسی ایک پہلو پر لکھا ہے۔

۲- بعض مؤلفین نے سیاست کے صرف تاریخی پہلو کو موضوعِ بحث بنایا ہے، چنانچہ انھوں نے مختلف زمانوں: عہدِ نبوت، خلافتِ راشدہ، عہدِ اموی، عہدِ عباسی اور عہدِ عثمانی میں اسلامی ریاست کے سیاسی ارتقاء کا مطالعہ کیا ہے۔

۳- بعض مصنفین نے صرف ان اصول ومبادی سے بحث کی ہے جنھیں اسلام نے سیاسی پہلو سے پیش کیا ہے۔ مثلاً حکم راں سے امت کا تعلق کیسا ہو؟ ان کے حقوق اور فرائض کیا ہیں؟ وہ کیا قواعد وضوابط ہیں جن پر اسلام میں نظامِ حکومت مبنی ہے؟ وغیرہ۔

۴- بعض اہل قلم نے دونوں طریقوں اور منہجوں کو جوڑ کر زیادہ جامع کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے اسلامی سیاسی نظریات اور مسلم ممالک کی حقیقی صورتِ حال کا موازنہ کیا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن و سنت کے بیان کردہ ان اصول و

مبادی پر عمل ہوا ہے یا نہیں؟ اور ہوا ہے تو کس حد تک ہوا ہے؟

یہ کتابیں علمی و تحقیقی اعتبار سے مختلف معیار کی تھیں۔ بعض کتابیں دقیق علمی انداز میں تحریر کی گئی تھیں، ان کا اعتماد شرعی نصوص اور ان کی عہدِ نبوت اور عہدِ خلافت راشدہ میں صحیح عملی مثالی تطبیق پر تھا اور ان میں واقعات اور نصوص میں کسی قسم کے تکلّف و تصنّع اور تاویل سے کام نہیں لیا گیا تھا اور نہ تحلیل و استنباط یا تشریح و تعلیل میں دھاندلی کا دخل تھا۔ یہ کتابیں اسلامی علمی سرمایہ میں اضافہ کا باعث اور محققین کے لیے مستند مرجع و مأخذ ثابت ہوئیں، جب کہ کچھ کتابیں اس معیار سے کم تر تھیں۔

اسلامی سیاسی نظام کے اہم مآخذ و مصادر

آئندہ سطور میں مسلم علماء کی تاریخ وفات کی ترتیب سے ان اہم کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو انھوں نے سیاست اور نظامِ حکومت و ریاست کے موضوع پر لکھی ہیں۔ ان میں وہ کتابیں بھی ہیں جن کا تعلق تاریخِ حکومت و سیاست سے ہے اور وہ کتابیں بھی جن میں وہ اخلاق و آداب بیان کیے گئے ہیں جن سے حکام و امراء کو آراستہ ہونا چاہیے، اسی طرح اس فہرست میں ان کتابوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو مذکورہ پہلوؤں پر مستقل طور سے لکھی گئی ہیں اور وہ کتابیں بھی ہیں جن میں اسلام کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ سیاست و ریاست کے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں۔

۱- **کتاب الخراج**، قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب الانصاری (م ۱۸۲ھ) (شاگرد امام ابوحنیفہ)، المطبعہ السّلفیہ، القاہرۃ ۱۳۵۲ھ، پھر یہ کتاب متعدد بار طبع ہوئی ہے۔ الرجبی نے اس کی شرح **فقہ الملوک و مفتاح الرتاج المرصد علی خزانۃ الخراج** کے نام سے کی ہے۔ یہ شرح بغداد میں ڈاکٹر احمد الکبیسی کی تحقیق سے شائع ہوئی ہے۔

۲- **الخراج**، یحییٰ بن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ)، تحقیق: احمد محمد شاکر، مطبعہ سلفیہ، القاہرۃ، ۱۳۸۴ھ

۳- **سلوک المالک فی تدبیر الممالک**، شہاب الدین بن ابی الربیع (م ۲۲۷ھ)، تحقیق: ڈاکٹر حامد عبداللہ ربیع، دارالشعب، القاہرۃ۔ یہ کتاب ڈاکٹر ناجی التکریتی کی

تحقیق کے ساتھ دار الشؤون الثقافیۃ العامۃ، بغداد سے بھی شائع ہوئی ہے۔

۴-**الإعلام بمناقب الإسلام**، ابوالحسن محمد بن یوسف العامری (م ۳۸۱ھ)، تحقیق ومطالعہ: ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب، دار الکاتب العربی، القاہرۃ، ۱۳۸۷ھ۔

۵-**السیاسۃ**، الحسین بن علی بن الحسین بن علی بن محمد بن یوسف بن بہرام، المعروف بالوزیر المغربی/ابن المغربی (م ۴۱۸ھ)، تحقیق: ڈاکٹر فؤاد عبدالمنعم احمد، مؤسسۃ شباب الجامعۃ، الاسکندریہ، مصر۔

۶-**لطف التدبیر فی سیاسۃ الملک**، محمد بن عبداللہ، المعروف بالخطیب الإسکافی (م ۴۲۹ھ)، تحقیق: احمد عبدالباقی، القاہرۃ، ۱۹۶۰ء

۷-**رسوم دار الخلافۃ**، ابوالحسین بن ہلال بن المحسّن الصابئ (م ۴۴۸ھ)، تحقیق: میخائیل عوّاد، مطبعہ العانی، بغداد، ۱۳۸۳ھ

۸-**الأحکام السلطانیۃ**، ابوالحسن علی بن محمد حبیب البصری الماوردی (م ۴۵۰ھ)، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، القاہرۃ، ۱۹۷۳ء۔ یہ کتاب بیروت اور سعودی عرب سے بھی کئی بار شائع ہوئی ہے۔

۹-**قوانین الوزارۃ وسیاسۃ الملک**، الماوردی (م ۴۵۰ھ)، تحقیق: ڈاکٹر رضوان السید، دار الطلیعۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء، اور تحقیق: فؤاد عبدالمنعم احمد اور محمد سلیمان داؤد، مؤسّسۃ شباب الجامعۃ، الاسکندریۃ، مصر ۱۹۷۸ء

۱۰-**نصیحۃ الملوک**، الماوردی (م ۴۵۰ھ)، تحقیق: محمد جاسم الحدیثی، دار الشؤون الثقافیۃ العامۃ بغداد، ۱۹۸۶ء

۱۱-**تسہیل النظر وتعجیل الظفر فی أخلاق الملک وسیاسۃ الملک**، الماوردی (م ۴۵۰ھ)، تحقیق: محی الدین السرحان، دار النہضۃ العربیۃ، بیروت، ۱۹۸۱ء، اور تحقیق: رضوان السید، دار الطلیعۃ، بیروت۔

۱۲-**الأحکام السلطانیۃ**، محمد بن الحسین بن محمد بن خلف الضرّاء البغدادی الحنبلی (م ۴۵۸ھ)، تحقیق: محمد حامد الفقی، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، القاہرۃ، ۱۹۶۶ء

۱۳-**غیاث الأمم فی إلتیاث الظلم**، عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف بن محمد

الجوینی (م۴۷۸ھ)، تحقیق: مصطفیٰ حلمی، دارالدعوۃ، الاسکندریۃ، ۱۹۷۹ء، اور تحقیق: عبدالعظیم الدین، القاہرۃ/ الدوحۃ، ۱۴۰۰ھ

۱۴-کتاب السیاسۃ أو الإشارۃ فی تدبیر الإمارۃ، محمد بن الحسن الحضرمی المعروف بالمرادی (م.....)، تحقیق: علی سامی النشار، دارالثقافۃ، الدارالبیضاء، ۱۹۸۱ء

۱۵-التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک، محمد بن محمد بن محمد بن احمد الطّوسی الشافعی، المعروف بحجۃ الاسلام الغزالی (م۵۰۵ھ)، تحقیق: محمد مصطفیٰ ابوالعلاء، مکتبۃ الجندی، القاہرۃ۔

۱۶-فضائح الباطنیۃ وفضائل المستظہریۃ، حجۃ الاسلام الغزالی (م۵۰۵ھ)، تحقیق: عبدالرحمٰن بدوی، القاہرۃ، اور تحقیق: نادی فرج درویش، المکتب الثقافی، بیروت۔

۱۷-سراج الملوک، محمد بن الولید بن محمد بن خلف سلیمان الفہری المالکی، المعروف بالطرطوشی (م۵۲۹ھ)، المطبعۃ الازہریۃ، القاہرۃ، ۱۳۱۹ھ

۱۸-رسالۃ فی آداب الحسبۃ والمحتسب، احمد بن عبداللہ بن عبدالرؤوف الاندلسی، (وفات اوائل چھٹی صدی ہجری)، ناشر: لیفی بروفنسال، المعہد الشرقی للآثار الشرقیۃ، القاہرۃ، ۱۹۵۵ء

۱۹-الإشارۃ إلی من نال الوزارۃ، ابوالقاسم علی بن منجب الصیرفی (م۵۴۲ھ)، تحقیق: أیمن فؤاد السید، الدارالمصریۃ اللبنانیۃ، ۱۴۱۹ھ

۲۰-تہذیب الرئاسۃ وترتیب السیاسۃ، محمد بن علی الحسن بن علی بن ابی علی القلعی (م۶۳۰ھ)، تحقیق: ابراہیم یوسف مصطفیٰ عجو، مکتبۃ المنار، الاردن، ۱۹۸۵ء

۲۱-السیاسۃ الشرعیۃ فی إصلاح الراعی والرعیۃ، احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ الحرانی الدمشقی الحنبلی، المعروف بشیخ الاسلام ابن تیمیۃ (م۷۲۷ھ)، تحقیق: محمد ابراہیم البنّا اور محمد احمد عاشور، دارالشعب القاہرۃ۔ یہ کتاب متعدد بار طبع ہوئی ہے اور مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ میں بھی شامل ہے۔

۲۲-الحسبۃ، شیخ الاسلام ابن تیمیۃ، مطبعۃ المؤید، القاہرۃ، ۱۳۱۸ھ۔ اس کے بھی بہت سے ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں۔

۲۳-معالم القربۃ فی أحکام الحسبۃ، محمد بن محمد بن احمد بن زید بن الأخوۃ القرشی

(م۷۲۹ھ)، تحقیق: محمد محمود شعبان اور صدیق المطیعی، الہیئۃ المصریۃ العامۃ، القاہرۃ، ۱۹۷۶ء

۲۴-تحریر الأحکام فی تدبیر أهل الإسلام، محمد بن ابراہیم بن سعداللہ بن جماعۃ (م۷۳۳ھ)، تحقیق: فؤاد عبدالمنعم أحمد، رئاسۃ المحاکم الشرعیۃ والشؤون الدینیۃ، الدوحۃ، قطر، طبع دوم، ۱۴۱۱ھ

۲۵-نصاب الإحتساب، عمر بن محمد بن عوض السنامی، (آٹھویں صدی ہجری)، تحقیق ومطالعہ: ڈاکٹر مریزن سعید عسیری، مکتبۃ الطالب الجامعی، مکہ المکرّمۃ، ۱۴۰۵ھ

۲۶-عین الأدب والسیاسۃ وزین الحسب والریاسۃ، ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن المعروف بابن ہذیل الأندلسی (آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی)، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، القاہرۃ، ۱۹۶۹ء

۲۷-الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، محمد بن ابی بکر ایوب بن سعد بن حریز الزرعی ثم الدمشقی الحنبلی المعروف بابن القیّم الجوزیۃ (م۷۵۱ھ)، تحقیق: محمد جمیل احمد، مطبعۃ المدنی، ۱۹۶۱ء۔ متعدد بار شائع ہوئی ہے۔

۲۸-المنہج المسلوک فی سیاسۃ الملوک، عبدالرحمٰن بن نصر بن عبداللہ الشیزری الطبری (م۷۴۷ھ)، مطبعۃ بولاق، القاہرۃ، ۱۸۴۱ء، اور دار المنار، الاردن۔

۲۹-نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ، عبدالرحمٰن بن نصر بن عبداللہ الشیزری الطبری، (م۷۴۷ھ)، تحقیق: السید الباز العرینی، لجنۃ التألیف والترجمۃ والنشر، القاہرۃ، ۱۹۴۶ء

۳۰-الإشارۃ إلی أدب الوزارۃ، محمد بن عبداللہ بن سعید بن احمد بن علی السلمانی الغرناطی الاندلسی (م۷۷۶ھ)، ناشر: عبدالقادر زمامۃ، مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق، جلد ۴۷، ۱۹۷۲ء، اور ناشر: وداد القاضی، مجلۃ الفکر العربی، بیروت، شمارہ ۲۳، اکتوبر-نومبر ۱۹۸۱ء

۳۱-الشہب اللامعۃ فی السیاسۃ النافعۃ، عبداللہ بن یوسف بن رضوان البخاری المالقی ثم الفاسی (م۷۸۴ھ) تحقیق: علی سامی النشار، دار الثقافۃ، الدار البیضاء، ۱۹۸۴ء

۳۲-واسطۃ السلوک فی سیاسۃ الملوک، موسیٰ بن یوسف ابوحمو بن زیان (م۷۹۱ھ)، مطبعۃ الدولۃ التونسیۃ، تونس، ۱۲۷۹ھ

۳۳-نهاية الرتبة فی طلب الحسبة ،محمد بن أحمد بن بسام المحتسب (وفات آٹھویں صدی ہجری)،تحقیق: حسام الدین السامرائی،مطبعۃ المعارف،بغداد،۱۹۶۸ء

۳۴-مقدمة ابن خلدون ،عبدالرحمٰن بن محمد بن محمد بن الحسن بن محمد الحضرمی الأشبیلی المعروف بابن خلدون (م۸۰۸ھ)،تحقیق: علی عبدالواحد وافی،مکتبۃ نہضۃ مصر،القاہرۃ۔ یہ کتاب بھی متعدد بار شائع ہوئی ہے۔

۳۵-مآثر الإنافة فی معالم الخلافة ،احمد بن علی بن احمد بن عبداللہ القلقشندی (م۸۲۱ھ)، تحقیق: عبدالستار احمد،سلسلۃ التراث العربی،الکویت،۱۹۸۴ء

۳۶-المقدمة السلطانية فی السياسة الشرعية،طوغان شیخ المحمدی الحنفی (م۸۸۱ھ)، تحقیق: عبداللہ محمد عبداللہ،مکتبۃ الزہراء،القاہرۃ،۱۴۱۸ھ

۳۷-بدائع السلک فی طبائع الملک ،محمد بن علی بن محمد بن الازرق الأصبحی الغرناطی الأندلسی المالکی (م۸۹۶ھ)،تحقیق: ڈاکٹر علی سامی النشار، بغداد، ۱۹۷۷ء، اور تحقیق: عثمان بن جمعہ ضمیریہ اور مطالعہ: ڈاکٹر محمد بن عبدالکریم،الدارالعربیۃ للکتاب،لیبیا/تونس،۱۹۸۰ء

۳۸-السياسة الشرعية ،إبراہیم بن یحییٰ خلیفہ المعروف بہ دودہ افندی،تحقیق: ڈاکٹر فؤاد عبدالمنعم،مؤسسۃ شباب الجامعۃ،الاسکندریۃ،۱۴۱۱ھ

۳۹-حجة الله البالغة ،شاہ ولی اللہ دہلوی (م۱۱۸۰ھ)،المطبعۃ المنیریہ،القاہرۃ،ناشر: السید سابق، دارالکتب الحدیثۃ، القاہرۃ، اور تحقیق : عثمان جمعۃ ضمیریۃ، مکتبۃ الکوثر، الریاض،۱۴۲۲ھ (یہ کتاب ہندوستان و پاکستان کے مختلف مطابع سے شائع ہوتی رہی ہے۔مترجم)

۴۰-السياسة الشرعية ،محمد بن حسین بن احمد بن محمد بن بیرم (م۱۲۱۴ھ)،المطبعۃ الاعلامیۃ، مصر،۱۳۰۶ھ، پھر اس کا تحقیق شدہ ایڈیشن مرکز جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث، دبئی، الامارات العربیۃ المتحدہ سے بھی منظر عام پر آیا ہے۔

۴۱-الدولة الإسلامية :نظامها و عمالاتها ،رفاعۃ بن بدوی بن علی بن محمد بن علی بن رافع الطہطاوی المصری الحسینی الشافعی (م۱۲۹۰ھ) مکتبۃ الآداب،القاہرۃ،۱۹۹۰ء۔اس کتاب کو ڈاکٹر محمد عمارۃ نے الأعمال الکاملۃ للطہطاوی میں بھی شائع کیا ہے۔

۴۲-الكرامة فی تبيان مقاصد الإمامة ،محمد بن علی بن حسن المعروف بالنواب

صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) مطبع شاہ جہانی، بھوپال، بدون تاریخ

۴۳-السیاسة الشرعیة وحقوق الراعی وسعادة الرعیة، عبداللہ بن حسن المعروف بہ برکت زادہ (م ۱۳۱۸ھ)، مطبعۃ الترقی، القاہرۃ، ۱۳۱۸ھ

سیاسی نظام سے متعلق کتابوں پر چند ملاحظات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سیاسی فکر پر مذکورہ بالا کتب میں سے بعض قدیم اور بعض معاصر کتب سے متعلق چند ملاحظات پیش کر دیے جائیں۔ اگرچہ کہ ان سب میں یا ان میں سے بیش تر کتابوں میں بہت سے بہترین پہلو بھی ہیں جن پر ان کے مؤلفین شکریے کے مستحق ہیں۔

(الف) عہد عباسی میں مدوّن قدیم کتب

۱- یہ کتابیں عموماً عہد عباسی کے احوال کی عکاسی کرتی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مؤلفین کو اس وقت کے حکام کی خواہشات کی تکمیل کی زیادہ فکر تھی۔

۲- ان میں سے بعض کتابیں حکومت و ریاست کی ایک شکل یا نمونہ (ماڈل) کو سامنے رکھتی ہیں، اس سے سرمو تجاوز کرتی ہیں نہ نظم ونسق کے اسالیب جو کہ مصلحت عامہ اور حالات وزمانہ کی تبدیلی کے تابع ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کے تغیر کو قبول کرتی ہیں۔

۳- بعض مسلم مفکرین حکومت و ریاست اور نظام حکومت کے بارے میں اغریقی (یونانی)، فارسی (ایرانی) اور ہندی فکر سے متأثر ہوئے ہیں، خاص طور سے مشرق میں فارابی، کندی اور ابن سینا اور مغرب میں ابن طفیل، ابن باجہ اور ابن رشد، اسی طرح اخوان الصفا وغیرہ۔ ان حضرات کے افکار یونانی فلسفہ کی صدائے بازگشت تھے۔ یہ اثر پذیری ان کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے جو امورِ سیاست میں امراء و حکام کی رہ نمائی کے لیے مختلف زمانوں میں اسلام میں حکومت کے موضوع پر کام کرنے والے فلاسفہ نے لکھی تھیں۔[۸]

۴- ان کتابوں میں نامانوس اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ معاصر علماء کو ان کتابوں میں سیاسی مدلول کی غیر مانوس اصطلاحات کے استعمال یا ایک زمانہ سے

دوسرے زمانہ میں ان کی تبدیلی کی شکایت ہوتی ہے، دوسری مشکل قدیم اصلی مصادر و مآخذ کے اختلاف کی وجہ سے مباحث کی ترتیب کے طریقہ میں ان کو پیش آتی ہے جو معاصر ترتیب وتبویب کے برخلاف غیر مرتب طور پر متفرق جگہ پھیلی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے کہ ان کو اوّلین اساسی مصادر کا علم ہوتا ہے نہ ان کے اسالیب ومناہج سے واقفیت۔۹

(ب) معاصر تالیفات

۱۔بعض معاصر مصنفین قانونی نظاموں سے موازنے میں پھنس کر غیر متعلق ایسی طویل بحثیں کرنے لگتے ہیں کہ اگر ان کو ایک کرلیا جائے تو وہ بجائے خود ایک مستقل کتاب بن جائے، جب کہ کتاب کا نام اسلام یا اسلامی نظام ہوتا ہے۔ان کے لیے زیادہ مناسب تھا کہ اگر ایسے موازنہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس میں اختصار کو ملحوظ رکھیں۔

۲۔بعض معاصر مؤلفین موضوع سے معمولی تعلق کی بنیاد پر اسلامی علوم کے مختلف گوشوں کو وسعت دے کر موضوعِ بحث اور اس کے مقصد سے ہٹ جاتے ہیں، اور علم اصول فقہ بشمول اُدلّۂ احکام، انواع حکم اور طریقہائے استنباط یا اسلامی نظریہ کے مصادر میں سنت کا ذکر آنے پر علم اصولِ حدیث پر تفصیل سے گفتگو کرنے لگتے ہیں۔

۳۔بعض اہل قلم اسلامی ریاستوں کے اعمال وتصرّفات اور غلط کاموں کو اسلامی سیاسی نظریہ کا ماخذ بنا کر بات الٹ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے عمل کو خود اسلام کے خلاف حجت بنا ڈالتے ہیں، حالاں کہ یہ طریقہ غلط ہے۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلام اس کے متبعین کے لیے حجت بنے، نہ کہ اس کے برعکس۔

۴۔اسی طرح وہ لکھنے والے بھی غلطی پر ہیں جو اسلامی نظام کو معاصر وضعی افکار ونظریات کے حامل مشرقی ومغربی مکاتب فکر کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہی کی اصطلاحات میں اسلامی نظام کی حقیقت اور حکومت وسیاست کے بارے میں اس کے احکام کی تعبیر کرتے ہیں، یا مغربی سیاسی نظاموں کے مظاہر میں سے جو ان کو اسلام کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں انھیں اسلام سے منسوب کردیتے ہیں۔

۵- وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو مذکورہ غلطی کا رد کرنے میں دوسری انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کا جواب صحیح علمی منہج کے بجائے ردِ عمل سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ گویا غلطی کا جواب دوسری غلطی سے دینا ہے، یا ایک انحراف کی تصحیح دوسرے بالمقابل انحراف سے کرنا ہے۔

۶- بعض معاصر کتابوں میں بحث وتوثیق کے علمی منہج سے تجاوز اور انحراف پایا جاتا ہے۔ ان کے مؤلفین نصوص کو نقل کرنے اور ان کے ترجمہ وتعبیر میں اختلاط والتباس کا شکار ہوئے ہیں، جس کی بنا پر وہ قدیم مؤلفین کی جانب ایسی باتیں منسوب کر دیتے ہیں جو انھوں نے نہیں کہی ہیں۔

مؤلفین کا نام لیے بغیر میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی بہت سی مثالیں مذکورہ تحریروں میں مل جائیں گی۔ یہاں ان مثالوں کو پیش کرنے کا موقع نہیں ہے۔ میرا مقصد مذکورہ بالا کتب کا کوئی تنقیدی مطالعہ یا اس علمی سرمایہ کا تجزیہ کرنا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مؤلفین نے اپنی اپنی کوشش کی اور ہر ایک کو اس کی کوشش کا بدلہ ملا۔

حواشی ومراجع

۱ ملاحظہ کیجیے: أصول النظم السیاسیۃ، أحمد سویلم العمری، ص۱۸-۲۲، أصول العلوم السیاسیۃ، محمد علی العوینی، ص۱۳-۱۷، مدخل الی النظریۃ السیاسیۃ، نصر محمد مھنّا، ص۲۲-۳۲، مبادئ علم السیاسۃ، نظام برکات اور دیگر، ص۱۴-۱۵، المدخل الیٰ علم السیاسۃ، محمود خیری عیسی اور بطرس نمائی، ص۳-۴، فی علم السیاسۃ الاسلامی، عبدالرحمٰن خلیفہ، ص۶۳-۶۹، موسوعۃ السیاسۃ، سامی کیالی، ۳۶۲/۳۔

۲ ملاحظہ کیجیے: مذاہب فکریۃ معاصرۃ، محمد قطب، ص۹ و مابعد، العلمانیون والإسلام، محمد قطب، ص۸-۳۱، المستقبل لہذا الدین، سید قطب، ص۲۷-۵۴، العلمانیۃ نشأتہا وتطورہا و آثارہا، سفر عبدالرحمٰن الحوالی، ص۱۲۳ و مابعد۔

۳ التقریر الإستراتیجی العربی، مرکز الدراسات السیاسیۃ والاستراتیجیۃ بالاہرام میں ص۱۷ پر مذکور ہے: ''سرمایہ دارانہ مغربی تہذیب جب سیکولر ہوکر بڑی حد تک مذہبی دائرہ

سے آزادی حاصل کرچکی جو کہ اس کے لیے عالم کے ادراک کا ذریعہ تھا تو اس کے سامنے خاص طور پر مارکسی نظام کے خاتمہ کے بعد اسلام، جو کہ توحید پر قائم ہے، کے علاوہ کوئی چیلنج باقی نہیں رہا۔ (تھافت العلمانیۃ، صلاح الصاوی، ص ۱۸۵

۴ الأمیر، نیقولا میکافیلین، عربی ترجمہ: خیری حماد، مطالعہ: فاروق سعد، ص ۱۴۸-۱۵۱۔

۵ أصول العلاقات الدولیۃ فی فقہ الامام الشیبانی، عثمان جمعہ ضمیریہ، ۱/۱۹۹، المدخل الی علم السیاسۃ، محمود خیری عیسی اور بطرس غالی، ص ۹۷، اصول العلوم السیاسیۃ، محمد علی العوینی، ص ۸۷-۸۹۔

۶ اصول العلوم السیاسیۃ، محمد علی العوینی، ص ۸۷-۸۹۔

۷ اس فہرست کی تیاری میں بیش تر کتابوں سے میری راست واقفیت کے علاوہ فہارس کتب اور نصر محمد عارف کی کتاب: مصادر التراث السیاسی الاسلامی سے مدد لی گئی ہے۔ مطبع اور سنہ طبع درج کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کتب کا یہی اکلوتا طبعہ ہے، ان کے دیگر طبعات بھی ہو سکتے ہیں، جن کا احاطہ کرنے کی میں نے کوشش نہیں کی ہے۔

۸ اس لیے ان دونوں قسم کی کتابوں پر علمی طریقہ کے مطابق اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ وہ اصلی اسلامی سیاسی فکر کی نمائندگی نہیں کرتی ہیں۔ اس کی صحیح نمائندگی فقہائے امت کی کتابیں کرتی ہیں جو شرعی مصادر پر اعتماد کے صحت مند طریقہ پر قائم تھے۔ ان کی اہم کتابوں کو سابق پیراگراف میں پیش کیا جاچکا ہے۔

۹ اس پیراگراف میں میں نے اس موضوع سے متعلق مؤلفات کا نامکمل استقراء کیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض معاصر کتب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے جیسے: منہاج الاسلام فی الحکم، محمد اسد، ص ۵۳-۵۶، الموسوعۃ السیاسیۃ، سامی الکیالی، ۳/۳۶۴-۳۶۵، نظام الاسلام: الحکم والدولۃ، محمد المبارک، ص ۶-۷، نظریۃ الاسلام وہدیہ فی السیاسۃ والقانون والدستور، ابوالأعلی المودودی، ص ۲۴۰-۲۴۵ (اردو میں اس کا نام اسلامی ریاست ہے۔ مترجم)، تراث الاسلام، شاخت اور بوزورتھ، ۲/۱۱۲ وما بعد، مبادئ نظام الحکم فی الاسلام، فؤاد محمد النادی، ص ۱۱-۱۳۔

(سہ ماہی آفاق الثقافۃ والتراث، دبئی، جلد ۱۶، شمارہ ۶۲، جولائی-ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷۲-۸۲)

تعارف وتبصرہ

صحیح المناقب علامہ ناصرالدین البانیؒ، مرتب: خسرو قاسم

ملنے کا پتا: علی اکیڈمی، ۳-رائے پورہ لاج، دودھ پور، علی گڑھ، صفحات: ۷۲، قیمت درج نہیں۔

کتبِ حدیث میں عموماً صحیح اور حسن احادیث کے ساتھ ضعیف اور موضوع روایات بھی پائی جاتی ہیں اور عام لوگوں کے لیے ان کے درمیان فرق وامتیاز کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور اپنے رحم وکرم کی بارش کرے محدثِ عصر علامہ محمد ناصرالدین البانیؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) پر جنھوں نے حدیث کی مشہور کتابوں: سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، الجامع الصغیر، الادب المفرد، الترغیب والترھیب اور موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان کی صحیح اور ضعیف احادیث کے الگ الگ مجموعے شائع کردیے ہیں۔ اسی طرح سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ اور سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ کے نام سے کئی مجلدات میں ان کا کام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ البانیؒ کی اس عظیم الشان خدمتِ حدیث نے عہد تدوین کے محدثین کرام کی یاد تازہ کردی ہے۔

زیرنظر کتاب میں حضرات فاطمہ، علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں مذکورہ بالا کتبِ حدیث کی وہ احادیث جمع کردی گئی ہیں جن پر علامہ البانیؒ نے 'صحیح' کا حکم لگایا ہے۔ احادیثِ مناقب کے سلسلے میں امت کے مختلف طبقات افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ فاضل مرتب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے 'اہل بیت' سے متعلق صحیح احادیث کا یہ مجموعہ مرتب کردیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ اسی کتاب میں اس موضوع کی وہ احادیث بھی جمع کردیتے جن پر علامہ البانی نے 'ضعیف' یا 'موضوع' کا حکم لگایا ہے، تاکہ شاہ راہِ اعتدال واضح ہوجاتی اور وہ احادیث بھی قارئین کے علم میں آجاتیں جنھیں اہل بیت کے مناقب وفضائل میں بیان کیا جاتا ہے، حالاں کہ وہ ضعیف یا موضوع ہیں۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۳۱)

☆ صدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کے فقہی مقالات کا ایک مجموعہ حال میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ مقالات شامل ہیں جو اب تک موصوف کی کسی کتاب کا جز نہیں بن سکے تھے۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے مقالات میں عصری اہمیت کے حامل متعدد موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ صفحات: ۱۸۴ قیمت: -/۱۰۰ روپے

☆ مولانا عمری کا ایک مضمون تحقیقات اسلامی اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۸ء میں 'دینی علوم کی تدریس- ہندوستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جسے علمی و دینی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ افادیت کے پیش نظر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے اسے کتابچہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ صفحات: ۲۰ قیمت: -/۱۲ روپے

☆ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب 'زندگی کے عام فقہی مسائل' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب ان سوالات و جوابات پر مشتمل ہے جو زندگی کے مختلف امور سے متعلق ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ صفحات: ۱۴۸ قیمت: -/۴۸ روپے

☆ گزشتہ دنوں فوج میں مسلم فوجیوں کے داڑھی رکھنے کے مسئلے پر حکومت نے ایک ایسا بیان دے دیا، جس سے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس مسئلے پر مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ اور مولانا سید احمد عروج قادریؒ کی بعض تحریریں جمع کر دی ہیں، جن سے دین میں داڑھی کے مقام اور وجوب پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مجموعہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے 'داڑھی کا مسئلہ' کے عنوان سے شائع ہوگیا ہے۔ صفحات: ۲۴ قیمت: -/۱۰ روپے

☆ ملک کے موقر ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی کا اٹھارہواں فقہی سمینار ۲۸ر فروری تا ۲ر مارچ ۲۰۰۹ء جنوبی ہند کے معروف شہر مدورائی کے جامعہ ریحان عربی کالج میں منعقد ہوا، جس میں ملک و بیرون ملک کے دوسو سے زائد مشاہیر فقہاء اور اصحاب علم نے شرکت کی۔ اس سمینار میں عصری اہمیت کے حامل چار موضوعات: پلاسٹک سرجری، تعلیمی قرض، قیدیوں کے حقوق اور عورتوں کی ملازمت زیر بحث آئے۔ صدر ادارہ مولانا عمری اور رکن ادارہ ڈاکٹر ندوی نے اس سمینار میں شرکت کی۔

☆ ادارہ میں الحمدللہ توسیعی خطبات کا پابندی سے انعقاد ہورہا ہے۔ ۱۸؍جنوری ۲۰۰۹ء کو جماعت اسلامی ہند کی مقامی یونٹ کے اشتراک سے 'فلسطین میں اسرائیلی بربریت' کے موضوع پر ایک پروگرام کا انعقاد ہوا، جس میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صدر ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ و ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ڈاکٹر عرشی خاں، ریڈر ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے اظہار خیال کیا۔ ۱۵؍فروری ۲۰۰۹ء کو جناب ایچ عبدالرقیب رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند، کنوینر اسلامی بینکنگ کمیٹی، جماعت اسلامی ہند و جنرل سکریٹری انڈین سینٹر فار اسلامک فائنس نئی دہلی نے 'مائکرو فائننسنگ - نظریہ اور تطبیق' کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا۔ دونوں پروگراموں میں مسلم یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اساتذہ اور دیگر اصحاب علم نے شرکت کی۔

☆ ادارہ کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ادارہ کے دوسالہ تصنیفی تربیت پروگرام کے مستفیدین کی اسکالرشپ میں اضافہ کردیا جائے۔ اس کے مطابق ان کو رہائش کی سہولت فراہم کرنے کے علاوہ پہلے سال ڈھائی ہزار روپے ماہانہ اور کارکردگی سے اطمینان کی صورت میں دوسرے سال تین ہزار روپے ماہانہ دیے جائیں گے۔ اس شعبہ کے تحت درخواستیں مطلوب ہیں۔ خواہش مند حضرات اس سلسلے میں سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (موبائل: 9410060558) سے رجوع کرسکتے ہیں۔

☆ ادارہ کے بعض بہی خواہان کے تعاون سے اس کے نئے کیمپس میں تعمیراتی کام جاری ہے۔ مین گیٹ سے دفتر کی عمارت تک سڑک کی تعمیر، کانفرنس ہال، لائبریری اور باتھ روم وغیرہ کی جزوی اصلاح، ڈرینج سسٹم کی درستگی کے علاوہ موجودہ عمارت کی پہلی منزل کی تعمیر جاری ہے۔ فوری طور پر کیمپس میں اسٹاف کوارٹرس اور لائبریری کی مستقل عمارت کی تعمیر کی اشد ضرورت ہے۔ اصحاب خیر سے گزارش ہے کہ ان کاموں کی تکمیل کے لیے اپنا فراخ دلانہ دست تعاون بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

☆ بعض تکنیکی وجوہ سے 'تحقیقات اسلامی' کی ویب سائٹ بند ہوگئی تھی، لیکن الحمدللہ اب وہ دوبارہ کام کرنے لگی ہے، البتہ اس کا ایڈریس تبدیل ہوگیا ہے۔ نیا ایڈریس یہ ہے:
www.tahqeeqi.com